ایمان، عقائد ونظریات ﴿حصہ دوم﴾

جلد: ۲

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

مواعظِ عثمانی

ایمان، عقائد و نظریات

جلدِ دوم

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا عنایت الرحمٰن

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

عرضِ ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبہ معارف القرآن کراچی نے "مواعظِ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی
طبع جدید : ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ - جولائی ۲۰۲۲ء
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
ترتیب و ڈیزائننگ : عمران خان

فون : (92-21) 35031565, 35123130
ای میل : info@mmqpk.com
ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com
آن لائن : fb/onlinesharia

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان - 75180

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

www.ONLINE SHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دارالاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبہ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۃ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدرآباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمرگرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرّہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کررہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کرلیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہوچکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ و خطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کرکے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کردیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماکر اس بےعمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

بندہ
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ
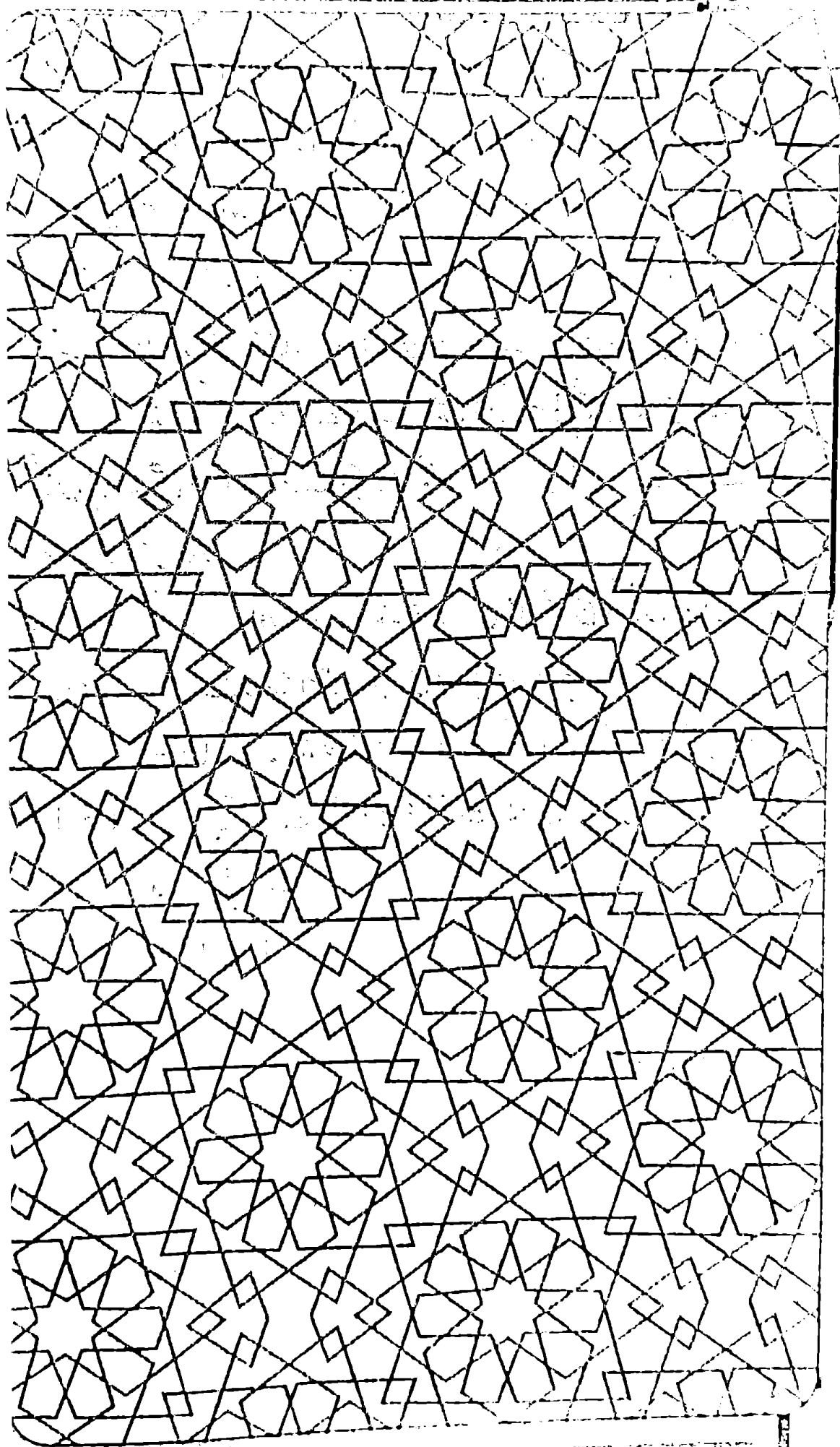
عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

زیر نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلدِ دوم ''ایمان وعقائد ونظریات (حصہ دوم)'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہورہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

عرضِ ناشر

مواعظِ عثمانی

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا — اصلاحی خطبات — اصلاحی مواعظ

اصلاحی مجالس — خطباتِ عثمانی — خطبات دورۂ ہند

درسِ شعب الایمان — نشری تقریریں — فرد کی اصلاح

اصلاحِ معاشرہ — تربیتی بیانات — ذکر و فکر

The Islamic months

اور اس کے علاوہ

آسان ترجمہ قرآن — اسلام اور ہماری زندگی — انعام الباری

تقریرِ ترمذی — جہانِ دیدہ — سفر در سفر

دنیا مرے آگے — اسلام اور جدید معاشی مسائل — اسلام اور ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، نیز ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ اور صوتی صورت میں محفوظ شدہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بعض بیانات و خطبات کو شامل کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس کی تصحیح اور تحقیق کا اہتمام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات ومضامین کا جامع اور مستند ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب، تحقیق وتخریج حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر ان کی نگرانی میں مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کی ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات اور تحقیق وتخریج کا طریقۂ کار اس مجموعہ کی پہلی جلد "ایمان و عقائد ونظریات (حصہ اول)" کے شروع میں درج ہے، اس کی مراجعت ان شاء اللہ مفید رہے گی۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے ادارہ کے جملہ احباب ومعاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین یارب العالمین۔

خضر قاسمی (ناظم ادارہ)
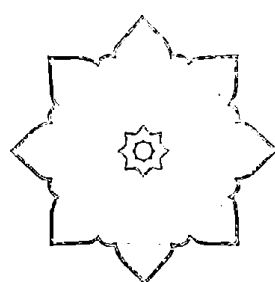
فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرستِ عنوانات

تفصیلی فہرست

صفحہ	عنوان
۱۲۸	ان کی دنیا اور ہے
۱۲۹	ہر واقعے میں حکمتیں پوشیدہ ہیں
۱۳۰	بچے کو قتل کرنے کی حکمت
۱۳۰	اپنی عقل کو چھوڑ دو
۱۳۱	موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر میں
۱۳۲	عبرت ناک واقعہ
۱۳۳	شدّاد پر ملک الموت کا ترس کھانا
۱۳۳	ایک آدمی پر دو مرتبہ ترس کھانا
۱۳۵	انبیاء علیہم السلام پر بلائیں سب سے زیادہ
۱۳۵	زلزلہ آنے میں حکمت اور مصلحت
۱۳۶	یہ زلزلہ عذاب تھا یا نہیں
۱۳۷	تفویضِ کامل اختیار کرو
۱۳۸	زلزلے میں بے شمار فوائد
۱۳۸	تخریب کے بعد تعمیر ہوتی ہے
۱۳۹	اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ
۱۴۱	**اللہ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو**
۱۴۴	تمہید
۱۴۴	تمہاری رائے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے مختلف ہونا
۱۴۵	خبر کی تحقیق کر لینی چاہیے
۱۴۶	تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہوگئی

کامیاب مومن کی صفات

(خطباتِ دورۂ ہند ص ۱۶۱)
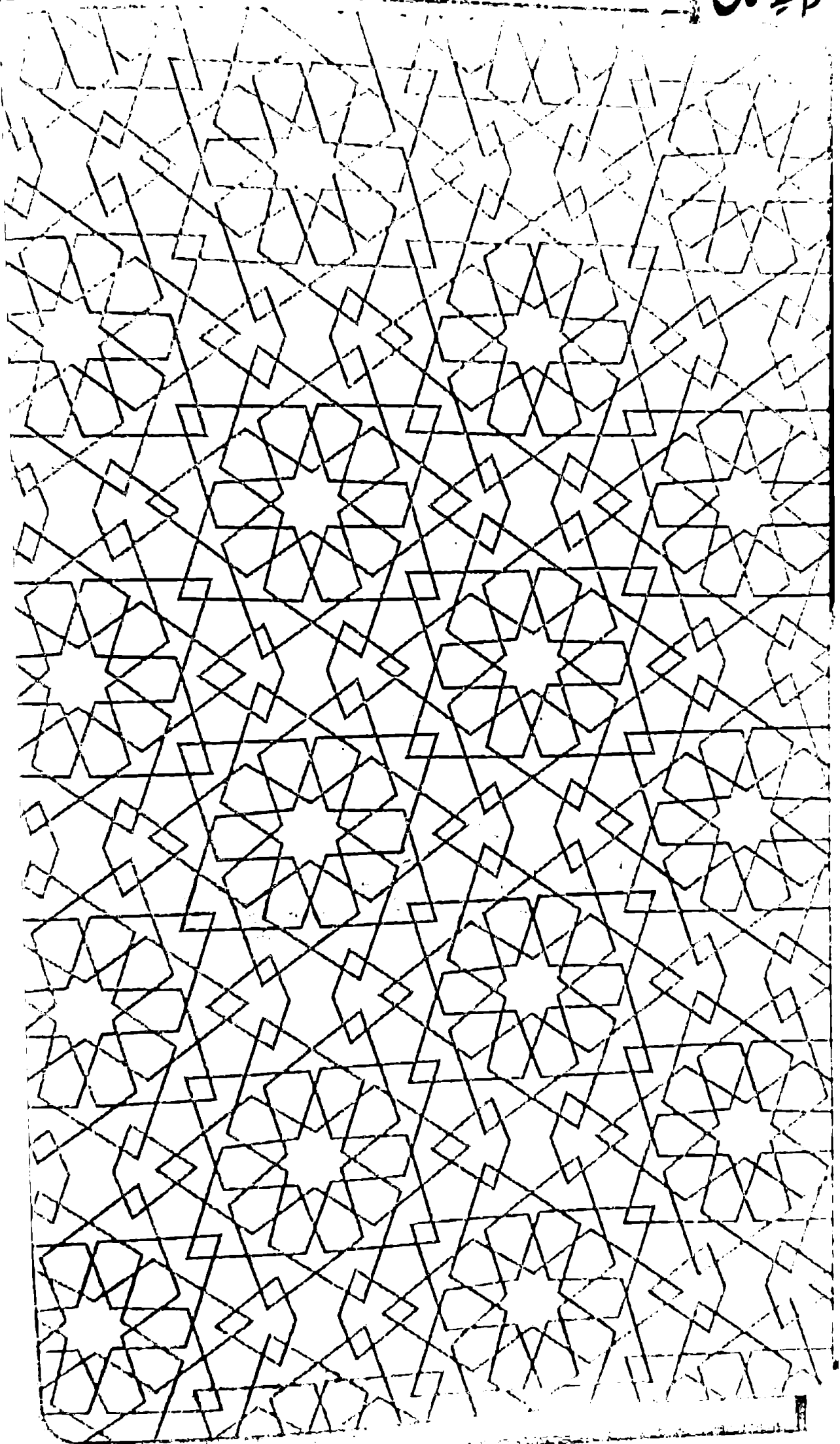
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کامیاب مومن کی صفات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝١ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝٢ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝٣ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝٤ (١)

(١) سورة المومنون الآية (١-٣)۔

امنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالك من الشاھدین والشاکرین، والحمد للّٰہ رب العالمین۔

تمہید

یہ ''سورۂ مؤمنون'' کی شروع کی تین آیتیں براہِ راست ہماری عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سورت کا آغاز اللہ نے عجیب انداز سے کیا ہے۔ فرمایا کہ بڑے کامیاب ہیں وہ مومن جن کی صفات اگلی آیتوں میں بیان کی جارہی ہیں تو اس سورت میں مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ اگر وہ حاصل ہوجائیں تو دونوں جہانوں کی کامیابی حاصل ہوجائے۔

آیات کریمہ کا ترجمہ

ترجمہ آیات کا یہ ہے کہ کامیاب ہوگئے وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، بے فائدہ اور بے ہودہ کاموں سے منہ موڑ لیتے ہیں، وہ مومن جو زکوۃ پر عمل کرتے ہیں، وہ مومن جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر وہ جو اُن کی بیویاں اور باندیاں ہوتی ہیں ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں تو کوئی ملامت نہیں، جو بیویوں کے علاوہ کسی سے کسی بھی طریقے سے خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگرانی کرتے ہیں اور مکمل پابندی کرتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے

وارث ہوں گے اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

خشوع وخضوع کا مطلب

تو جو صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ مؤمن ہی کامیابی وفلاح پا سکتے ہیں، جو ان صفات کے حامل ہوں۔ ان آیات میں سے میں صرف شروع کی چار آیتوں کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ مؤمن فلاح یاب ہوسکتے ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ نماز میں خشوع پیدا کرنا بھی مطلوب ہے اور نماز اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں خشوع نہ ہو، خشوع کا کیا مطلب ہے؟ ''خشوع'' کا مطلب عربی زبان میں یہ ہے کہ دل کا کسی کی طرف متوجہ ہوکر جھک جانا۔ ایک لفظ ہے ''خضوع'' اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کے ظاہری اعضاء اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے باادب کھڑا ہو، جس طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہے کہ ہاتھ صحیح جگہ پر باندھے ہوئے ہوں، نگاہ سجدہ کی جگہ پر ہو، جب رکوع وسجدہ کرے تو پوری طرح کرے، جو ظاہری اعضاء ہیں وہ اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں، اس کو خضوع کہتے ہیں اور ''خشوع'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ کی طرف جھکا ہوا ہو، یعنی نماز کے اندر اس کو یہ احساس ہو کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں اور اس کی عبادت کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو گویا میں دیکھ رہا ہوں ورنہ کم از کم یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں اس کا نام ''خشوع'' ہے۔

اپنی نمازوں کا جائزہ لیں

آج ذرا ہم اپنی نمازوں کا جائزہ لیں، جو نمازوں کے پابند بھی ہیں شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو جو خشوع کا ایسا اہتمام کرتا ہو جیسا کہ مطلوب ہے اور بعض لوگ تو بالکل مایوس ہوجاتے ہیں کہ ہم سے خشوع ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ جب ہم نماز شروع کرتے ہیں تو ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ دل کہیں ہے اور دماغ کہیں ہے۔ عام طور سے حالت یہ ہوتی ہے جیسا کہ کوئی Switch-on کردیا کہ automatic زبان سے الفاظ نکلتے جارہے ہیں اور دل کہیں ہے، دھیان کہیں ہے، نہ سجدہ میں دھیان ہے، نہ قرآن میں دھیان ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نماز کے بعد اگر کسی سے پوچھا جائے کہ پہلی رکعت میں کیا قرأت ہوئی اور دوسری میں کیا ہوئی؟ تو یہ بھی یاد نہیں رہتا، تو نماز کی ایسی ناقدری کرکے مایوسی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور مایوسی کا نتیجہ بعض اوقات شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ جب نماز ویسی نہیں ہے تو کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی، یہ خیال پیدا کرکے نماز ہی سے محروم کردیتا ہے۔

خشوع حاصل کرنے کا طریقہ

نماز میں خشوع ہم کس طرح پیدا کرسکتے ہیں؟ اس حکم پر کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اختیار سے آدمی ان الفاظ کی طرف دھیان دے جو وہ زبان سے ادا کررہا ہے، اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی نے نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کہا اس کو پتہ ہونا چاہیے کہ میں اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کہہ رہا

ہوں اپنے اختیار سے، اپنا دھیان، توجہ اور خیال ان الفاظ کی طرف لگائے جو وہ زبان سے ادا کررہا ہے یہ خشوع ہے۔ اگر اتنا بھی کرے گا تو خشوع حاصل ہوجائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمے کوئی ایسا کام نہیں لگایا جو اس کے اختیار سے باہر ہو، اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اس لیے اگر بے اختیار خیالات آجائیں تو وہ خشوع کے منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہے۔ آپ نے نماز پڑھنی شروع کی دھیان لگا کر "اَللّٰہُ اَکْبَر" کہا "سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ" کہا پھر ذہن غیر اختیاری طور پر کسی طرف چلا گیا تو یہ غیر اختیاری طور پر ذہن کا کسی طرف چلا جانا معاف ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ پر کوئی گناہ نہیں، لیکن جب یاد آجائے پھر فوراً انہی الفاظ کی طرف لوٹ جائیں جو زبان سے ادا کررہے ہیں۔ اتنا کرلے تو خشوع کا ادنی درجہ جو مطلوب ہے وہ حاصل ہوجائے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خشوع

بعض اوقات مایوسی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بڑے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ تھے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنے کھجور کے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، وہاں ایک پرندہ آیا اور کھجور کے درختوں میں الجھ گیا، نکلنا چاہتا تھا، مگر باغ اتنا گھنا تھا کہ نکلا نہیں جارہا تھا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا خیال اس طرف لگ گیا کہ دیکھو میرا باغ کتنا شاندار ہے، کتنا بڑا ہے کہ ایک پرندہ نکلنا چاہتا ہے، مگر نکل نہیں پارہا ہے۔ اس غلطی کے کفّارے میں انہوں نے وہ سارا باغ ہی صدقہ کردیا کہ اس کی وجہ سے میرا دھیان ہٹ گیا۔ (۱)

---

(۱) مؤطا امام مالك ۹۸/۱ (٦٨) طبع دار احياء التراث العربي. والزهد لابن المبارك ۱۸٥/۱ (٥٢٦) والسنن الكبرى للبيهقي ٤٩٢/٢ (٣٨٧٣)۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ جنہیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر ایک خاص جگہ پر پہرہ دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔ وہ پہرہ دے رہے تھے سوچا کہ خالی کھڑا ہوں تو نماز کی نیت باندھ لوں نفل نماز شروع کردی اور نماز کے دوران دشمن کی طرف سے ایک تیر آیا، ان کو لگا، جس سے خون کا فوّارہ جاری ہوگیا، لیکن انھوں نے نماز نہیں توڑی، بلکہ جاری رکھی شاید اس وقت یہ معلوم نہیں ہوا ہوگا کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز ختم ہو جاتی ہے، لیکن ان پر ایسا غلبہ ہوا کہ لوگوں کے پوچھنے پر کہا کہ میں نے ایک سورت شروع کر رکھی تھی اس میں ایسا لطف آرہا تھا کہ اس کے ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خشوع کا یہ عالم تھا۔ (۱)

غیر اختیاری خیالات معاف ہیں

بعض مرتبہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس درجے کا خشوع ہم پیدا نہیں کرسکتے جس کے نتیجے میں مایوسی ہوجاتی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کسی کو بھی اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا، بزرگوں نے یہ فرمایا ہے کہ خشوع کا ادنیٰ درجہ ہر مسلمان کے لیے یہ ہے جس کی اس کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی نماز میں ان الفاظ کی طرف دھیان کرے جو وہ اپنی زبان سے نکال رہا ہے اور اگر غیر اختیاری طور پر کوئی اور خیال آجائے تو وہ معاف ہے، پھر جب دوبارہ متنبّہ ہو تو پھر وہ ان الفاظ کی طرف آجائے، وہ اگر

---

(۱) سنن ابی داود ۱/۵۰ (۱۹۸) والحدیث سکت عنہ ابو داود والمنذری فی "مختصرہ" ۱/۷٤ (۱۹۸) ومسند احمد ۲۳/۵۱ (۱٤۷۰٤) وصحیح ابن حبان ۳/۳۷۵ (۱۰۹٦)۔

پوری نماز میں یہی کرتا رہے کہ خیال بھٹک رہا ہے تو یہ واپس لا رہا ہے تو بھی ان شاء اللہ اس کی نماز اللہ کی رحمت سے خشوع کے تحت لکھ دی جائے گی۔ اللہ کی رحمت ایسی ہے کہ اس کے خشوع میں لکھے جانے کی امید ہے۔

پابندی نماز پر شکر

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح بھی نماز پڑھنے کی توفیق ہو جائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کی توفیق ہوگئی۔ چلو دل کہیں اور دماغ کہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق عطا فرمائی یہ بھی کوئی کم نعمت نہیں۔ کتنے ہیں جن کو یہ بھی توفیق نہیں ہوتی، اس واسطے اس کی ناقدری بھی نہیں کرنی چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح بھی پڑھوادی، چاہے دل و دماغ کہیں بھٹک رہا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہوا کہ اس نے توفیق دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ ؎

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

وہ سجدہ جس کو تیری بارگاہ سے نسبت ہے یہ بھی ایک نعمت ہے، جس طرح سے بھی ہو جائے اس پر شکر ادا کرو، اس کی ناقدری نہ کرو۔

اپنی کوتاہی پر استغفار

ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے نماز کے بعد استغفار کرو۔ حدیث میں آتا ہے

جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے تھے،[1] حالانکہ استغفار کسی گناہ پر کیا جاتا ہے، لیکن نماز کے بعد جو استغفار کرتے تھے وہ اس لیے کہ اے اللہ! جیسی نماز ہمیں آپ کی بارگاہ میں پڑھنی تھی ویسی ہم پڑھ نہ سکے۔ اس لیے استغفار کرنا ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ کا شکر اور اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتا چلا جائے تو ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ضرور اپنا فضل فرمائیں گے۔

ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ کے پاس ایک مرتبہ ایک صاحب آئے آکر کہنے لگے کہ حضرت میں کیا بتاؤں؟ نماز میں کیا پڑھتا ہوں، بس ٹھونگیں مارتا ہوں اور وہ نماز اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتی، کیونکہ دل میں گندے خیالات آتے ہیں، سجدہ کرتا ہوں اس کے اندر بھی گندے خیالات آتے ہیں تو یہ کیا نماز ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ اگر یہ سجدے ایسے ہیں کہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل نہیں تو ایسا کرو کہ بجائے اللہ کو ایسا سجدہ کرنے کے مجھے کردو۔ تو کہا کہ حضرت! آپ نے یہ کیا بات کہہ دی! سجدہ آپ کو کیسے کرسکتا ہوں؟ حضرت نے فرمایا جب تم یہ کہتے ہو یہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق نہیں تو اللہ کے بجائے ایسا سجدہ گندے انسان کو کرو تو اس نے کہا کہ یہ تو نہیں ہوگا، تو فرمایا کہ اگر یہ نہیں ہوسکتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ پیشانی اللہ کے علاوہ کسی کے آگے جھک نہیں سکتی تو اس کی قدر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پیشانی اسی کے آگے جھکنے کے لیے رکھی ہے۔ اس پر تم اللہ کا شکر

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۴۱۴ (۵۹۱) وسنن الترمذی ۱/۳۳۱ (۳۰۰)۔

ادا کرو۔ پھر یہ کہو کہ اے اللہ! آپ نے یہ توفیق عطا فرمائی، لیکن مجھ سے یہ کوتاہیاں ہو گئیں، اے اللہ! تو اس کو معاف فرما۔

شیطان کی کمر توڑنے والے کلمے

اور یہ بات بھی میں نے اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے سنی تھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص نماز پڑھنے کے بعد دو کلمے کہہ لے تو شیطان کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی، دو کلمے کیا ہیں؟ فرمایا کہ ایک اَلْحَمْدُ لِلّٰہ دوسرا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ۔ جب یہ دو کلمے آدمی کہہ لیتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔ کیوں! اس لیے کہ شیطان انسان کو دو طریقوں سے بہکاتا ہے۔ ایک یہ کہ تو کیا؟ تیری نماز کیا؟ تو نے فضول ٹکر ماری ہے؟ مایوسی پیدا کرتا ہے۔ تو اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے یہ نماز اپنی توفیق سے ادا کرائی اور دوسرا شیطان کا جال یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان کے دل میں بڑائی پیدا کرتا ہے کہ چلو اچھی اچھی نماز پڑھنے کی توفیق ہو گئی۔ پہلے کے مقابلے میں اچھی نماز پڑھ لی۔ آدمی کا دماغ سوچنے لگتا ہے کہ میں نے بڑا کام کر لیا اور ولی اللہ بن گیا۔ عربی زبان میں یہ مثل مشہور ہے:

"صَلَّی الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْیَ"

ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعتیں پڑھیں جو کہ پہلے نہیں پڑھی تھیں اب اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجھ پر وحی نازل ہو گی۔ تو بعض اوقات شیطان انسان کے دل میں عبادت کے بعد تکبر پیدا کرتا ہے تو علاج ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ یعنی جیسی نماز پڑھنی تھی ویسی ادا نہ ہو سکی، اس میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان پر استغفار ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت

بعض روایتوں میں یہ بات ملتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت کے بعد فرماتے تھے:

مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِك...وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِك(١)

یعنی اے اللہ آپ کی عبادت کا جو حق تھا وہ ادا نہ ہوسکا۔کون کہہ رہا ہے؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کہ آپ رات میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اتنا طویل قیام فرماتے کہ پاؤں میں ورم آجاتا(٢)۔سجدے میں جاتے ہیں تو لوگوں

---

(١) ويستأنس له من حديث أخرجه مسلم في "صحيحه" ٣٥٢/١ (٤٨٦) عن عائشة قالت: فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الفراش، فالتمسته، فوقعت يدي على بطن قدميه وهو في المسجد وبها منصوبتان، وهو يقول: "اللهم أعوذ برضاك من سخطك وبمعافاتك من عقوبتك وأعوذبك لا أحصي ثناء عليك أنت كما أثنيت على نفسك". ومن حديث أخرجه محمد بن نصر المروزي في "تعظيم قدر الصلاة" ٨٠٨/٢ (٨٠٢) عن معاذ بن جبل أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إنكم لو عرفتم الله حق المعرفة لمشيتم على البحور، ولزال بدعائكم الجبال، ولو أنكم خفتم الله كحق الخوف لعلمتم العلم الذي ليس معه جهل، وما بلغ ذلك أحد قط، قلت: ولا أنت يارسول الله؟ قال: ولا أنا .... الحديث." ومن حديث أخرجه الطبراني فى "المعجم الأوسط" ٤٤/٤ (٣٥٦٨) عن جابر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ما في السماوات السبع موضع قدم، ولا شبر، ولا كف، إلا وفيه ملك قائم، أو ملك راكع، أو ملك ساجد، فإذا كان يوم القيامة قالوا جميعا: سبحانك ما عبدناك حق عبادتك، إلا أنا لم نشرك بك شيئا". والله سبحانه وتعالى أعلم.

(٢) صحيح البخارى ١٣٥/٦ (٤٨٣٦) و ٥٠/٢ (١١٣٠)۔

کو خیال ہوتا تھا کہ کہیں روح پرواز تو نہیں کرگئی۔ بالآخر آپ ﷺ
دیکھتے تھے (۱)۔ تو ایسی ذات کیا کہتی ہے جیسی عبادت کا حق ہے وہ ادا نہ ہوئی۔
جب آپ ﷺ یہ فرماتے ہیں تو ماوشما کی عبادت کا کیا حال؟ غرض جو بھی
عبادت ادا ہوئی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوئی مگر اپنی طرف سے جو کوتاہی ہوئی
ہے اس پر استغفار ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے جتنی کوشش ہو اس میں کسر نہ کی جائے اور
الفاظ کی طرف دھیان رکھا جائے۔ اگر درمیان میں کچھ غیر اختیاری خیالات
آگئے تو معاف ہے۔

خشوع پیدا کرنے کا ایک اور طریقہ

خشوع پیدا کرنے کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو سورتیں رٹی ہوئی ہوں
وہ نہ پڑھی جائیں، جو سورتیں Automatic چلتی ہوں ان کو نہ پڑھا جائے،
بلکہ ان سورتوں کو پڑھا جائے جو زیادہ نہ پڑھی جاتی ہوں۔ ایسی صورت میں یہ
ہوگا کہ وہ دھیان سے ادا کرے گا کہ کہیں اٹک نہ جائے، لہٰذا دھیان نہیں بھٹکے
گا۔ ہمیں چاہیے کہ روزانہ یاد کرکے کسی نہ کسی ایسی سورت کا اضافہ کرلیں جو پہلے
سے یاد نہیں تھی۔ اس طرح پڑھنے سے رفتہ رفتہ ان شاء اللہ نماز میں دھیان باقی
رہے گا، اسی طرح کھڑے ہونے کی حالت میں نگاہ سجدے کی جگہ پر ہو۔ یہ جو
کہا گیا کہ نگاہ سجدے کی جگہ پر ہو اس کا بڑا ہی اثر ہے، اس لیے کہ اگر
اِدھر اُدھر دیکھے گا تو دھیان ضرور بھٹکے گا۔

---

(۱) شعب الایمان ۳۶۱/۵ (۳۵۵٤) وقال ہذا مرسل جید۔

تو یہ چند باتیں جن کو ذہن میں رکھ کر عمل کرنے سے نماز میں جو خشوع مطلوب ہے وہ حاصل ہوگا اور ان شاء اللہ، اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ کامیاب لوگوں میں داخل ہو جائے گا۔

ترکِ لایعنی

دوسری صفت جو اس سورت میں بیان کی گئی ہے، وہ ہے:

''وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن''

وہ لوگ لغو کاموں اور لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں، یعنی لغو کاموں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لغو ایسے کام اور ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ مؤمن کی شان یہ بتائی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْه''(۱)

آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے یہ ہے کہ ایسے کاموں کو ترک کر دے جن کا کوئی فائدہ نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی ۱٤۸/٤ (۲۳۱۷) وقال: هذا حدیث غریب لا نعرفه إلا من حدیث ابی سلمه عن ابی ہریرة۔ وذکره المنذری فی ''الترغیب والترهیب'' ۳٤٥/۳ وقال: رواته ثقات الا قرة بن حیویل، ففیه خلاف، وقال ابن عبد البر النمری: هو محفوظ عن الزهری بهذا الاسناد من روایة الثقات انتهی، فعلی هذا یکون اسناده حسنا، لکن قال جماعة من الائمة: الصواب انه عن علی بن الحسین عن النبی صلی الله علیه وسلم مرسل، کذا قال احمد وابن معین والبخاری وغیرهم، وهکذا رواه مالک عن الزهری عن علی بن الحسین، ورواه الترمذی ایضا عن قتیبة عن مالک به، وقال: هذا عندنا اصح من حدیث ابی سلمة عن ابی هریرة، والله اعلم۔

اوقاتِ زندگی سونے کی مانند ہیں

یہ بھی بڑی اہم بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو زندگی ہمیں اور آپ کو عطا فرمائی ہے اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ زندگی اس لیے دی گئی ہے کہ اس زندگی کے بعد کی ابدی زندگی یعنی آخرت کو درست کیا جائے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ [1]

اللہ نے جو کچھ دنیوی زندگی میں عطا کیا ہے اس کے ذریعے سے تم اپنی آخرت کو درست کرو، اس لیے کہ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اس کے بجائے جو فضول کاموں میں لگتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک آدمی کو سونا اور کیچڑ اٹھانے کو کہا جائے تو یہ سونا اٹھانے کے بجائے کیچڑ اٹھالے تو ساری دنیا اُسے احمق سمجھے گی، اس لیے اس زندگی کے لمحات کی قدر کی جائے۔ ایک مرتبہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہہ لو یہ میزان میں بڑا زبر دست وزن پیدا کرتا ہے، [2] لہٰذا فضول باتوں اور کاموں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے۔

دین کے نام پر فضول بحثیں

کبھی شیطان دین کا نام لے کر یا دین کی بات کہہ کر فضول باتوں اور فضول بحثوں میں لگا دیتا ہے۔ مثلاً یزید فاسق تھا یا نہ تھا؟ ارے بھائی تم سے قبر میں کیا یہ سوال ہوگا کہ یزید فاسق تھا یا نہیں؟ تو یہ لایعنی بحث ہے کہ نہ دنیا میں اب اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں پوچھا جائے گا۔ یہ لایعنی میں داخل

---

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۷).

(۲) ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۲۰۳/۱ (۲۲۳).

ہے۔ ایک مرتبہ والدِ محترم رحمۃ اللہ علیہ بیان کر رہے تھے ایک آدمی نے سوال کیا کہ یزید۔ فاسق تھا یا نہیں؟ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مجھے تو نہیں معلوم کہ فاسق تھا یا نہیں، البتہ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ کہیں میں تو فاسق نہیں ہوں اور قرآن میں فرمایا گیا ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ (۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو گزر گئے ہیں، ان کے اعمال ان کے ساتھ ہیں تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں، تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیسا عمل کرتے تھے۔

تو اس قسم کی جو باتیں ہیں جس سے مسلمانوں میں جھگڑے اور اختلاف پیدا ہوتے ہیں وہ لغو میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لفظِ زکوٰۃ کی تشریح

تیسری صفت مؤمنوں کی یہ بتائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ پر عمل کرتے ہیں، یہ عجیب الفاظ قرآنِ کریم میں استعمال کیے گئے ہیں، سیدھے سادھے الفاظ یہ تھے اٰتو الزکوٰۃ جو دوسری جگہوں میں بیان کیے گئے ہیں، یہاں بھی یہ الفاظ استعمال کیے جاسکتے تھے مگر یہاں ایسا نہیں کہا گیا، بلکہ فرمایا

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۳٤)۔

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوۡنَ یہ وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کا عمل کرتے ہیں، اس کا اردو ترجمہ کرنا بھی آسان نہیں ہے۔

اس بات کو سمجھیے کہ زکوٰۃ کے عربی میں اور قرآن کی اصطلاح میں بھی دو معنی ہیں، ایک معنی وہ ہے جو عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ دوسرا معنی زکوٰۃ کا قرآن کی اصطلاح کے مطابق یہ ہے کہ اپنے اخلاق و کردار کو پاکیزہ بنایا جائے، یہ بھی زکوٰۃ ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں بھیجے جانے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے "وَیُزَکِّیۡهِمۡ"[1] کہ وہ انسان کو پاک صاف بناتے ہیں۔ کس چیز سے پاک صاف؟ گناہوں سے، شرک سے، بدعات سے، برے اخلاق سے پاک صاف کرکے ان کے اندر اچھی عادتیں پیدا کرتے ہیں، تو زکوٰۃ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے کردار، اعمال اور اخلاق گندگیوں سے پاک وصاف ہوجائیں اور خاص طور پر جو باطنی رذائل ہوتے ہیں ان کے پاک کرنے کے لیے "تزکیہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے دل میں حسد، بغض، نام ونمود، دکھاوا نہ رہے، بلکہ اخلاص آجائے، تکبر نہ رہے تواضع آجائے، تو یہ زکوٰۃ ہے۔ یہاں پر مفسرین کی ایک بڑی جماعت اس سے یہی معنی مراد لیتی ہے، اس لیے کہ یہاں پر "فاعلون" کہا گیا یعنی اپنے اخلاق کو پاک کرنے کا عمل کرتے ہیں۔[2]

---

(۱) سورة البقرة آیت (۱۲۹).

(۲) روح المعانی ۲۰۸/۹ طبع دار الکتب العلمية، وتفسير ابن كثير ٤٠٣/٥ طبع دار الكتب العلمية۔

باطنی پاکیزگی کے لیے شیخ کی ضرورت ہے

عام طور پر یہ باطنی پاکیزگی کسی شیخ کی تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ بیماریاں ایسی ہیں کہ آدمی کو خود معلوم نہیں ہوتیں۔ اگر کسی انسان میں تکبر ہے تو خود اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر یہ بیماری ہے، بڑے سے بڑا متکبر بھی اپنے آپ کو متکبر نہیں سمجھے گا اور وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا کہ میرے اندر تکبر ہے۔ عربی میں اس کی اچھی مثال دی ہے کہ متکبر کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے تو وہ اوپر ہونے کی وجہ سے سب لوگوں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور جو لوگ نیچے کھڑے ہیں وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں تو متکبر شخص تمام لوگوں کو حقیر اور چھوٹا سمجھتا ہے اور ساری دنیا اس کو حقیر سمجھتی ہے، اس کی عزت نہیں کرتی، وہ چاہتا ہے کہ میری عزت ہو، لیکن متکبر کی عزت کسی کے دل میں نہیں ہوتی، زبردستی کوئی اس کے سامنے احترام کا معاملہ کرے تو وہ الگ بات ہے، لیکن جو متکبر ہوگا عام آدمیوں کے دلوں میں اس کی عزت نہیں ہوگی۔

یہ ایسی بیماری ہے جس کا خود پتہ نہیں چلایا جا سکتا، جس طرح جسمانی بیماری کا پتہ لگانے کے لیے کوئی ڈاکٹر ہوتا ہے، اس سے تشخیص کروائی جاتی ہے، اسی طرح باطنی امراض کے پہچاننے والے وہ اہل اللہ ہوتے ہیں جو خود اپنا تزکیہ دوسرے اللہ کے کسی نیک بندے سے کروا چکے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چلا آرہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے تابعین رحمہم اللہ علیہم کا اور انہوں نے اپنے بعد کے لوگوں کا، اسی طرح یہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے اور قرآن میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (1)

تقوی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تقوی والوں کے ساتھ ہو جاؤ، ان کی صحبت میں رہو، وہ بتائیں گے کہ تمہارے اندر کیا کیا بیماریاں ہیں اور پھر ان بیماریوں کا علاج بھی بتائیں گے۔ بعض اوقات اس کے لیے کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان باطنی امراض سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ اصلاح

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں لوگ اپنی اصلاح کے لیے جاتے تھے تو بعض اوقات حضرت ایسے ایسے علاج کرتے تھے جن سے ان کی اصلاح ہوتی۔ کسی کو کہہ دیا کہ نماز کے بعد یہ اعلان کرو کہ بھائی میرے اندر تکبر کی بیماری ہے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میرے اندر سے تکبر دور کردے۔ جو آدمی اس طرح کرے گا تو اس کے اندر کی بیماری خاک میں مل جائے گی۔ کسی کو کہہ دیا کہ جو لوگ مسجد میں آتے ہیں اُن کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ اور ہر زمانے کے لحاظ سے اور ہر طبیعت کے لحاظ سے مشائخ علاج تجویز کرتے ہیں، بعض اوقات مدتیں گزرنے کے بعد وہ بیماریاں دور ہوتی ہیں۔

پیشِ مردِ کاملے پامال شو

ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے کچھ مدت بزرگوں کے ساتھ رہنے کی توفیق ہوئی، مگر میں جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ بعض اوقات لوگ بزرگوں کے

---

(1) سورۃ التوبۃ آیت (١١٩)۔

پاس کچھ وظیفہ حاصل کرنے لیے جاتے ہیں اور اسی کو وہ پیری مریدی سمجھتے ہیں، حالانکہ اصل مقصود ان روحانی بیماریوں کا علاج ہے جس میں آدمی مبتلا ہے۔ جب میں اور میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب دونوں حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب عارفی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے ہم پر پابندی لگا دی کہ دس سال تک کوئی وعظ نہیں کہو گے، کوئی تقریر نہیں کرو گے۔ اب لوگوں کی دعوتیں آرہی ہیں، بلاوا آرہا ہے، اصرار ہو رہا ہے، لیکن حضرت کی طرف سے ممانعت ہے، کبھی غیر ملک سے دعوت دی جا رہی ہے، کبھی اندرون ملک سے دعوت آرہی ہے۔ غرض الحمد للہ دس سال کی پابندیوں میں رہے، کوئی تقریر اور وعظ نہیں کہا، جس کے نتیجے میں الحمد للہ بڑا عجیب نفع اور بڑا زبردست فائدہ ہوا، تو مثال یہ دی کہ صرف وظیفہ پڑھ لینے کا نام پیری مریدی نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود شیخ سے اصلاحی تعلق قائم کرکے اپنی بیماریوں کا علاج کرانا ہے۔

قال را بگذار مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

جب آدمی کسی اللہ والے کے سامنے پامال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کرم فرما دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ اس کا علاج ہوجاتا ہے۔ اپنے اخلاق کی پاکیزگی کے لیے تقریباً لازمی چیز یہی ہے کہ کسی اللہ والے کے ساتھ رہا جائے اور اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ پہلے زمانے میں تو اللہ والے بڑے لمبے چوڑے مجاہدے کراتے تھے، مگر اب وہ قوتیں نہیں رہیں، اس لیے ہمارے حضرت

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت آسان کر دیا۔ بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت کریں گے تو پابندیاں کرنی پڑیں گی اور ہماری حالت تو پہلے ہی سے خراب ہے، لیکن بات یہ ہے کہ حالت کی درستگی اسی میں ہے کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔

زکوٰۃ کے لیے کچھ عمل درکار ہے

دوسرے معنی ''لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ'' کے وہ ہیں جو عام طور پر مراد لیے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ وہی زکوٰۃ ہے جس کا نماز کے ساتھ اکثر ذکر کیا جاتا ہے، مگر قرآن میں جو تعبیر بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے لیے عمل کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ ہے کہ جس کے لیے کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، ایسا نہیں کہ پیسے اٹھائے اور فقیر کو دے دے، بلکہ اس کے لیے عمل درکار ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی ٹھیک حساب لگائے کہ میرے کتنے مال پر زکوٰۃ آتی ہے اور وہ کتنی ہے؟ اور اس کو صحیح مصرف پر خرچ کرنے کا اہتمام کرے، یہ نہیں کہ اس کو جیسے چاہے ادا کر کے اپنے سر سے بلا ٹال دی، بلکہ اس کو صحیح مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ [1]

زکوٰۃ اندازے سے نہ نکالی جائے

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اندازے سے نکال دیتے ہیں، یعنی جتنی آمدنی ہے اس کا حساب کیے بغیر محض اندازہ سے رقم نکال دی کہ بھائی ہم نے اتنی نکال دی، اس سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ نکال دی، مگر اس سے زکوٰۃ کا

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۵/۴۰۳ و روح المعانی ۹/۴۰۸۔

حق ادا نہ ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ زیادہ واجب ہو اور کم نکال دی گئی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ صحیح مصرف پر خرچ نہ ہو، اس لیے اندازے سے نہ نکالے، بلکہ سال کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے، جیسے آپ اندازے سے نماز نہیں پڑھ سکتے، اسی طرح زکوٰۃ بھی اندازے سے نکال نہیں سکتے، بلکہ زکوٰۃ کا پورا حساب کرنا ضروری ہے اور اس کے احکام کا سیکھنا ضروری ہے کہ زکوٰۃ کس سرمایے پر فرض ہوتی ہے اور کس پر نہیں اور کس پر کس حساب سے فرض ہوتی ہے؟ خاص طور پر تاجر حضرات کے لیے اس کا سیکھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ"(۱)

علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جس چیز میں وہ لگا ہوا ہے اس کے متعلق تمام شرعی احکام کا جاننا ضروری ہے اور اگر وہ تاجر ہے تو اس کے ذمہ ضروری ہے کہ

---

(۱) سنن ابن ماجه ۱/۲۱٤ (۲۲٤) طبع دار الجيل. ومسند البزار ۱۳/۲٤۰ (٦۷٤٦) طبع مكتبة العلوم والحكم. والحديث ذكره السخاوى فى "المقاصد الحسنه" ص ٤٤۰ رقم ٦۰- طبع دار الكتاب العربى -وقال: ابن ماجه فى سننه، وابن عبد البر فى العلم له، من حديث حفص بن سليمان، عن كثير بن شنظير، عن محمد بن سيرين، عن انس، مرفوعاً به ... وحفص ضعيف جدا، بل اتهمه بعضهم بالكذب والوضع، وقيل عن احمد: انه صالح، ولكن له شاهد عند ابن شاهين فى "الافراد"، ورويناه فى "ثانى السمعونيات" من حديث موسى بن داود، حدثنا حماد بن سلمة، عن قتادة، عن انس، به، وقال ابن شاهين: انه غريب، قلت: رجاله ثقات، بل يروى عن نحو عشرين تابعيا عن انس... الخ۔

تجارت کے تمام احکام کو جانے اور اگر زکوٰۃ فرض ہے تو زکوٰۃ کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کے سلسلے میں چند غلط فہمیاں

اب بے شمار غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً ایک غلط فہمی یہ ہے کہ ہر آدمی جانتا ہے کہ وہ مال جس پر زکوٰۃ فرض ہے اس کے لیے ایک سال کا گزرنا ضروری ہے، لیکن اس کا غلط حساب یہ کرتے ہیں کہ اگر میرے پاس دو روپے بھی آئے تو سمجھتے ہیں کہ ان پر الگ سال گزرنا ضروری ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ایک تاریخ ہونی چاہیے جس تاریخ کو آپ اُس کا حساب لگائیں۔ شرعاً یہ وہ تاریخ ہے جس میں آپ پہلی مرتبہ صاحب نصاب ہوئے ہیں اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ رمضان ہی میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، شرعاً پہلی مرتبہ جس تاریخ میں آپ صاحبِ نصاب بنے وہی زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ ہے، جب اگلے سال وہ تاریخ آئے گی اور اس میں بھی آپ صاحبِ نصاب رہے تو زکوٰۃ واجب ہے، اس درمیان اگر چہ ایک دن پہلے ہی ایک روپیہ آیا ہے تو اس پر دوسرے ہی دن اس کا حساب بھی زکوٰۃ میں لگایا جائے گا۔

مثلاً یکم شوال کو آپ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو اگر انتیس ۲۹ رمضان میں دس ہزار روپے آپ کے پاس آگئے تو یکم شوال میں اس دس ہزار کا بھی حساب لگائیں گے، اس پر الگ سے سال گزرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ طریقہ یہ ہے کہ جس تاریخ کو آپ نے متعین کیا ہے اس میں جو کچھ Balance آپ کے پاس ہے، اس کا حساب لگایا جائے گا، چاہے درمیان میں پیسے آتے جاتے رہے ہوں۔ بسا

اوقات لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ کس مال کی زکوٰۃ نکالنی ہے، ایک تاجر ہے اس کے پاس جتنا مالِ تجارت ہو چاہے وہ Finished Goods کی شکل میں ہو یا Raw Material کی شکل میں ہو، سب کی قیمت لگائی جائے گی، صرف Cash پر نہیں، بلکہ اگر Financial Papers لیے ہیں تو اُن پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، مقررہ تاریخ کو ان سب کی قیمت لگا کر چالیسواں حصہ نکالا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ اگر اندازاً زکوٰۃ نکال دی تو کہیں گے کہ زکوٰۃ نکال دی، مگر ''لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْن'' پر عمل نہیں ہوا، زکوٰۃ کے عمل کرنے والوں میں شامل نہیں ہوگا، تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ سے حضرات علماءِ کرام سے اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ اس کا جاننا ہر صاحبِ نصاب تاجر پر فرضِ عین ہے۔

ایک چھوٹی سی کتاب ہے میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی دامت برکاتہم کی، احکامِ زکوٰۃ کے نام سے ہے، اس میں انھوں نے آج کل کے لحاظ سے مسائلِ زکوٰۃ کی تشریح لکھی ہے۔ وہ مطالعہ کریں اور بہتر یہ ہے کہ کسی اچھے بڑے مفتی سے اس کے احکام معلوم کرلیں اور اس کے بعد زکوٰۃ نکالیں، تاکہ اللہ تعالیٰ ہمیں ''وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْن'' میں شامل کردے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان آیتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
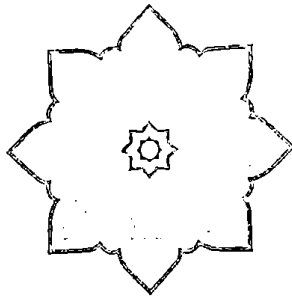
نفاق کی علامتیں

(نشری تقریریں ص ۹۳)
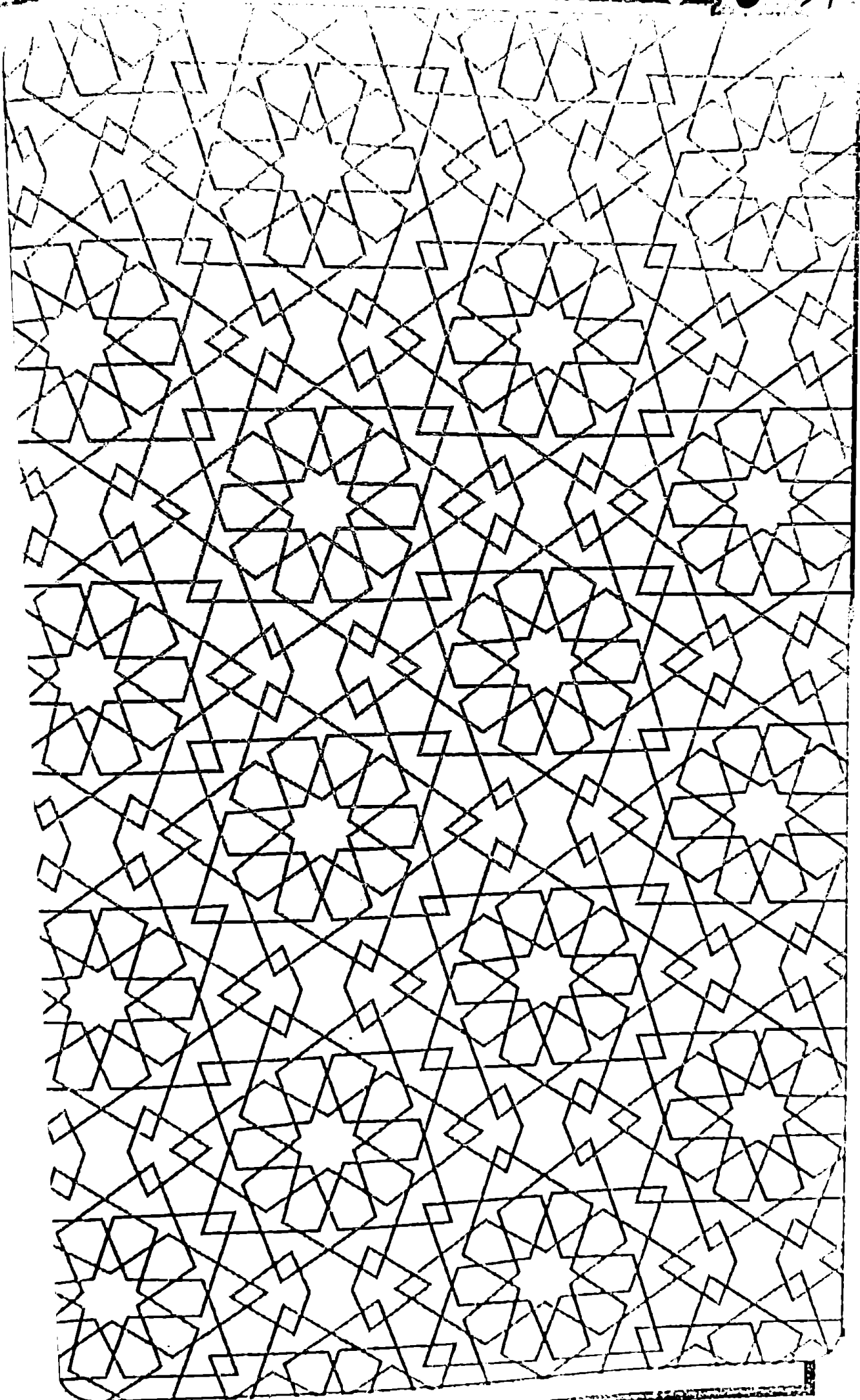
بسم اللہ الرحمن الرحیم

نفاق کی علامتیں
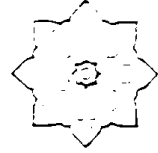
نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

"عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: "أربع من كن فيه كان منافقا خالصًا ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها، اذا اؤتمن خان، واذا حدث كذب، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر" [1]

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس شخص

(۱) صحیح البخاری ۱۰۲/٤ (۳۱۷۸) وصحیح مسلم ۷۸/۱ (۵۸)۔

میں وہ چاروں جمع ہوجائیں تو وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں ان چار خصلتوں میں سے کوئی ایک خصلت پائی جاتی ہوتو جب تک وہ اسے چھوڑ نہ دے گا اس وقت تک اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود رہے گی۔ (وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ) جب اس کوکسی امانت کا امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے جھگڑا ہوتو بدزبانی پر اُتر آئے۔

اس حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار بری خصلتیں بیان فرما کر انہیں منافق کی نشانی قرار دیا ہے، یعنی کسی مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ان خصلتوں کو اختیار کرے، بلکہ جو شخص ان میں مبتلا ہوگا، وہ قانونی اور لفظی اعتبار سے خواہ مسلمان کہلاتا ہو، لیکن عملی اعتبار سے وہ منافق ہے۔

ان میں سے پہلی خصلت امانت میں خیانت ہے، اس خیانت کی ایک صورت تو وہ ہے جسے سب جانتے ہیں یعنی یہ کہ کوئی شخص اپنا کوئی مال ومتاع یا سامان کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھوائے اور وہ امانت کو بہ حفاظت واپس کرنے کے بجائے اس میں خرد برد شروع کردے، یہ تو خیانت کی واضح ترین اور بدترین صورت ہے، جسے سبھی گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیانت صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ خیانت کی بعض صورتیں اور بھی ہیں، مثلاً کسی شرعی عذر کے بغیر کسی شخص کا راز فاش کردینا بھی خیانت ہے، ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"المجالس بالأمانة"(۱)

مجلسیں امانت ہوتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مجلس میں جو بات کہی جاتی ہے وہ آپ کے پاس امانت ہے اور شرکائے مجلس کی مرضی کے بغیر وہ بات دوسروں تک پہنچانا اس امانت میں خیانت ہے، جو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

اسی طرح جب کوئی شخص کسی جگہ ملازمت کرتا ہے تو اس کی ڈیوٹی کے اوقات اس کے پاس امانت ہیں۔ اب اگر وہ ان ڈیوٹی کے اوقات کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں صرف کرنے کے بجائے اپنے ذاتی کاموں میں صرف کرے تو شرعی اعتبار سے یہ شخص بھی امانت میں خیانت کر رہا ہے اور اس خیانت کو عادت بنالینا کسی مسلمان کا نہیں، بلکہ منافق کا کام ہے۔

حدیث میں نفاق کی دوسری خصلت جھوٹ بیان کی گئی ہے، جس کی مذمت سے قرآن وحدیث لبریز ہیں اور ایمان اور جھوٹ میں اس قدر زبرست تضاد ہے کہ مؤطا امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) میں حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ "کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے"؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" (مسلمان میں یہ کمزوری ہوسکتی ہے)۔ پھر پوچھا کہ "کیا مسلمان بخیل ہوسکتا؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" (مسلمان میں اس کمزوری کا وجود بھی ممکن ہے)۔ آخر میں پوچھا کہ "کیا مسلمان جھوٹا ہوسکتا ہے"؟ آپ نے

---

(۱) سنن ابی داود ٢٦٨/٤ (٤٨٦٩) ومسند احمد ٤٥/٢٣ (١٤٦٩٣) والسنن الکبری للبیهقی ٤١٧/١٠ (٢١١٦٢) وذکرہ المناوی فی "التیسیر" ٤٥٤/٢ وقال باسناد حسن، طبع مکتبہ الإمام الشافعی، الریاض۔

فرمایا: ''نہیں!'' (یعنی ایمان کے ساتھ بے باکانہ جھوٹ کی ناپاک عادت جمع نہیں ہوسکتی)[1]۔

پھر بعض اوقات تو انسان کے جھوٹ کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے اور بعض اوقات اس کے جھوٹ سے پورے خاندان، برادری یا ملک وملت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پہلی صورت میں تو یہ محض ایک گناہِ کبیرہ ہے، لیکن دوسری صورت میں بعض اوقات صرف ایک مرتبہ کا جھوٹ کئی کئی سنگین گناہوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ جھوٹ تو وہ چیز ہے جسے اسلام نے مذاق میں بھی گوارہ نہیں کیا[2] چہ جائیکہ سنجیدگی کے ساتھ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا جائے اور اس کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے منافق کی نشانی قرار دیا ہے۔

نفاق کی تیسری علامت حدیث میں ''عہد شکنی'' بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ کوئی عہد اور معاہدہ کرلے تو جب تک وہ معاہدہ باقی ہے، اس وقت تک ہر قیمت پر اس کی پابندی کرتا ہے اور اس معاملے میں بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ تاریخِ اسلام ایسے واقعات سے لبریز ہے، جن میں مسلمانوں نے صرف اپنا عہد نبھانے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو صرف

---

(۱) تهذيب الآثار للطبري ۱۱۳/۱ (۲۳۵)، طبع مطابع الصفا، ويؤيده ما جاء فى مسند البزار ۳۴۰/۳ (۱۱۳۹) ومسند أبى يعلى ۶۷/۲ (۷۱۱) وقال الهيثمى فى ''مجمع الزوائد'' ۲۷۳/۱ (۳۲۸) رواه البزار وأبويعلى ورجاله رجال الصحيح۔

(۲) مسند احمد ۲۷۸/۱۴ (۸۶۳۰)۔ وقال الهيثمى فى "مجمع الزوائد" ۹۲/۱ (۳۲۵): رواه احمد، والطبرانى فى الاوسط، وفيه منصور بن اذين، ولم ار من ذكره۔

عہد شکنی کے خطرے کے پیشِ نظر ایک مرتبہ اپنا ایک مفتوحہ علاقہ رومیوں کو واپس کر دیا تھا[1]۔

نفاق کی چوتھی نشانی حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب کبھی اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آجائے تو ایسا شخص بدزبانی اور گالم گلوچ پر اُتر آتا ہے، زندگی میں بہت سے لوگوں سے اختلاف پیش آتا ہے، کبھی نوبت جھگڑے تک بھی پہنچتی ہے، لیکن ایک سچے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اختلافات اور جھگڑوں کے موقع پر بھی شرافت و اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اختلاف خواہ نظریاتی ہو یا سیاسی یا خاندانی یا تجارتی، کسی بھی حال میں بدزبانی اور دشنام طرازی مسلمان کا شیوہ نہیں، بلکہ اس حدیث کی رو سے عملی نفاق کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق کی ان خصوصیات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

(۱) سنن ابی داود ۸۳/۳ (۲۷۵۹) وسنن الترمذی ۲۳۷/۳ (۱۵۸۰) وقال ھذا حدیث حسن صحیح۔
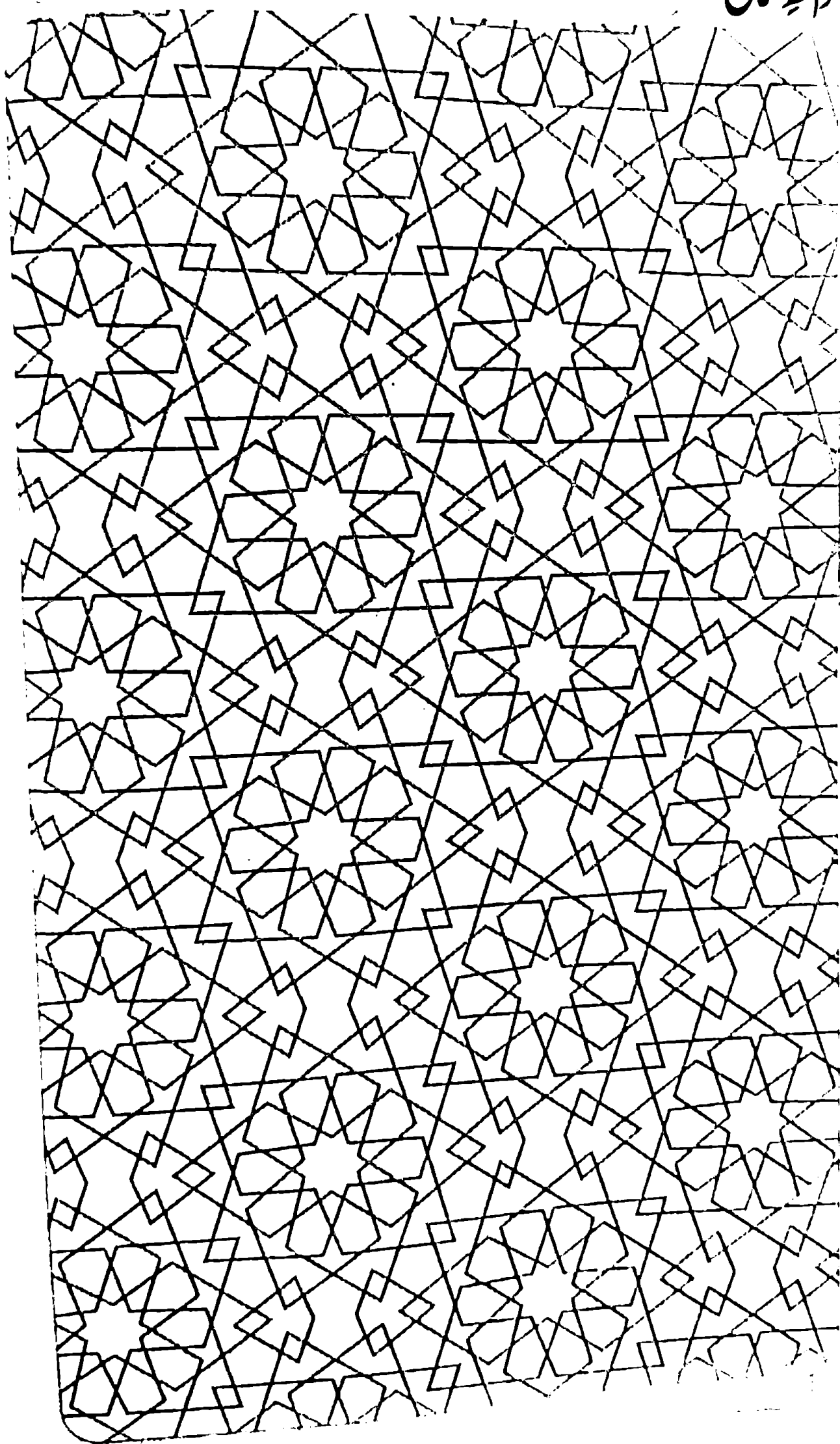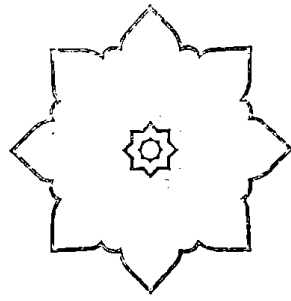
زبانی ایمان قابلِ قبول نہیں

(اصلاحی خطبات ج ۱۷ ص ۱۶۷)
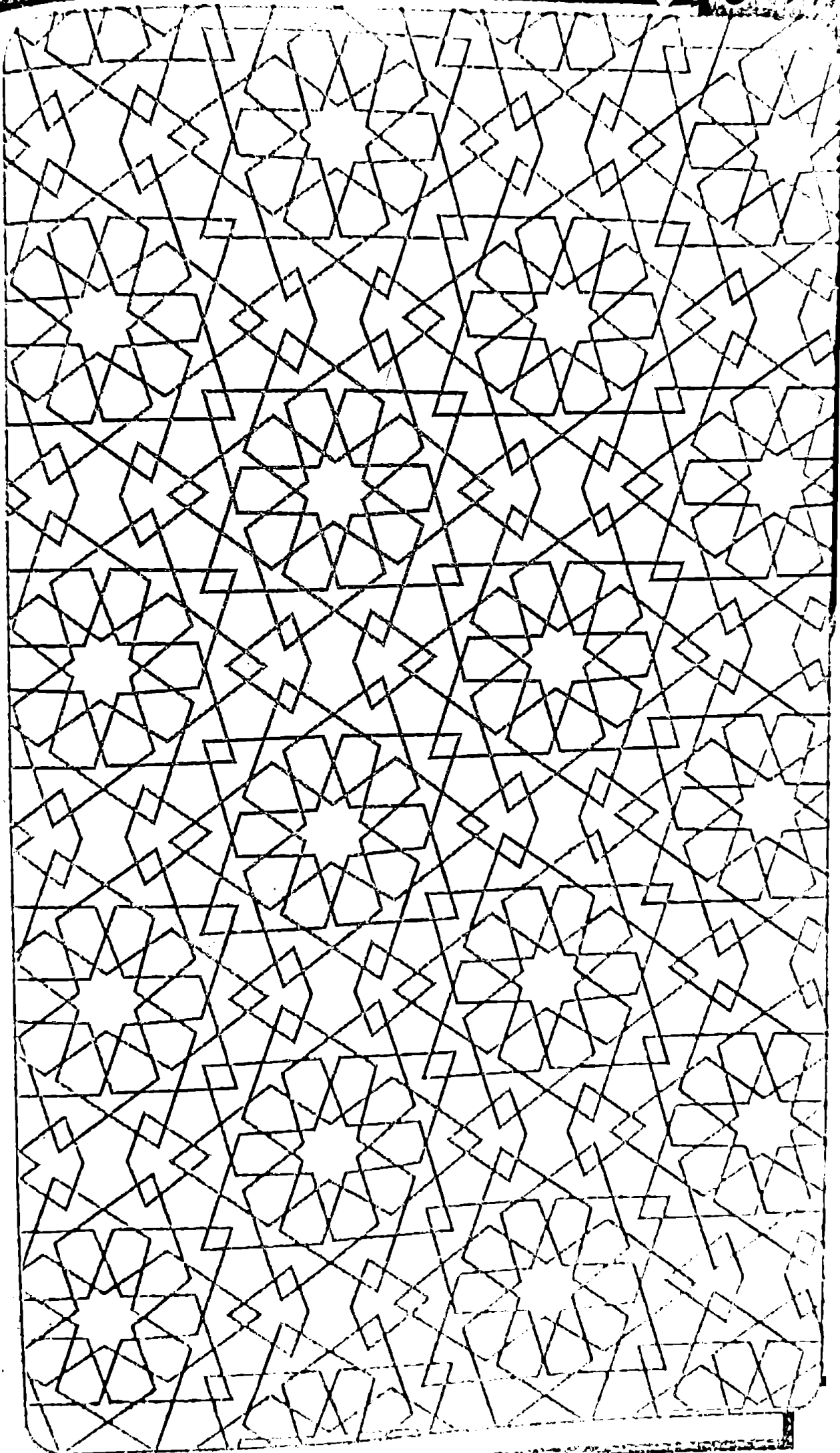
بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبانی ایمان قابلِ قبول نہیں
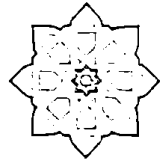
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا

اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ [1]

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! کافی عرصے سے ''سورۃ الحجرات'' کی تفسیر اور تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے اور آج میں نے اس سورت کی آخری آیات آپ حضرات کے سامنے تلاوت کیں، اس پر ان شاء اللہ ''سورۃ الحجرات'' کی تفسیر مکمل ہوجائے گی، جو آیات میں نے ابھی آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان کے شانِ نزول کا ایک خاص واقعہ ہے۔

(۱) سورۃ الحجرات آیت (۱۴تا۱۸)۔

شانِ نزول

واقعہ یہ ہے کہ عرب میں کچھ دیہاتی لوگ تھے، جن کو ''اعرابی'' کہا جاتا ہے اور جن کو ''بدو'' بھی کہتے ہیں، یہ لوگ مدینہ منورہ میں آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور ظاہری اعتبار سے اسلام قبول کرلیا۔

جب اسلام قبول کرلیا تو مدینہ منورہ میں کچھ عرصہ رہے تو انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نت نئے مطالبات شروع کردیے کہ ہم چونکہ اسلام لے آئے ہیں لہٰذا ہماری مالی مدد کریں، فلاں چیز ہمیں دیں اور انداز ایسا اختیار کیا کہ گویا اسلام لاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر احسان کیا ہے، اور اگر مطلوبہ چیز ان کو مل جاتی تو وہ خوش ہوجاتے اور اگر نہ ملتی تو انداز ایسا اختیار کرتے جیسے ہمارے مسلمان ہونے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا، تو ان لوگوں کے بارے میں آخری آیات نازل ہوئی ہیں[1]۔

پہلی آیت کا ترجمہ

پہلے ان آیات کا ترجمہ سن لیں، پھر ان کی تشریح عرض کروں گا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دیہاتی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ان سے کہہ دیں کہ تم ابھی تک ایمان نہیں لائے، ہاں! یہ کہو کہ ہم نے سر جھکا دیا ہے، ظاہری اعتبار سے تم نے اسلام قبول کرلیا ہے،

---

(۱) اسباب النزول للواحدی ص ۳۹۶ طبع دار الاصلاح دمام۔

ظاہری اعتبار سے تم نے کلمہ شہادت پڑھ لیا ہے اور بظاہر تم نے اطاعت اختیار کر لی ہے، لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو گے، فرماں برداری کرو گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے اعمال میں سے کسی عمل میں کمی نہیں کریں گے، بلکہ ہر عمل کا پورا پورا ثواب دیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والے ہیں، بہت رحمت کرنے والے ہیں۔

دوسری آیت کا ترجمہ

اب سوال پیدا ہوا کہ یہ جو کہا گیا کہ تم ابھی تک ایمان نہیں لائے، بلکہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا ہے تو حقیقی ایمان لانے کی علامت کیا ہے؟ اس کے بارے میں باری تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا کہ صحیح معنی میں ایمان لانے والے وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک کا اظہار نہیں کیا۔ وہی بات کہ اگر کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہو گیا تو ٹھیک ہے اور اگر کوئی دنیاوی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو کہنے لگے کہ ہمارے اسلام لانے کا تو کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تو ایمان لانا نہ ہوا، یہ تو شک کا اظہار ہوا اور جب کہ صحیح معنی میں اسلام لانے والے وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پھر شک میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔

تیسری آیت کا ترجمہ

آگے فرمایا کہ اے محمد ﷺ! آپ (ان اعرابیوں اور دیہاتیوں سے) کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتے ہو اور بتانا چاہتے ہو کہ تم نے ایمان قبول کرلیا ہے، تم اسلام لے آئے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور تمہارے دل کی گہرائیوں میں جو باتیں ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اس وجہ سے تم اللہ تعالیٰ کو یہ کہہ کر دھوکہ نہیں دے سکتے کہ تمہارا دین اسلام ہے اور تم مسلمان ہوگئے ہو حقیقت میں تم مسلمان نہیں ہوئے ہو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

چوتھی اور پانچویں آیت کا ترجمہ

پھر فرمایا کہ یہ لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں اس بات کا کہ وہ اسلام لے آئے، گویا کہ اپنے اسلام لانے کا احسان آپ پر رکھتے ہیں۔ اے محمد (ﷺ)! آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ، اس لیے کہ اوّل تو تم صحیح معنی میں مسلمان ہوئے ہی نہیں ہو، ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا، تم نے صرف دنیاوی فائدے حاصل کرنے کے لیے کلمۂ شہادت پڑھ لیا ہے، لہٰذا حقیقت میں تو تم مسلمان نہیں ہوئے، لیکن اگر تم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے بھی ہو اور صحیح معنی میں اسلام قبول کرلیا ہو تب بھی تمہارا کوئی احسان اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے کہ تم نے اسلام قبول کرلیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کے چھپے ہوئے

بھید سے واقف ہے، آسمان اور زمین میں جتنے راز ہیں، جتنی خفیہ چیزیں ہیں، ان سب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کو دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اسی پر سورت ختم ہوئی، یہ تھا ان آیات کا ترجمہ جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں۔

محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام ایمان نہیں

ان آیات میں دو تین باتیں ہیں، جو ہمارے اور آپ کے لیے بڑے عظیم سبق پر مشتمل ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایمان درحقیقت محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں کہ بس زبان سے کلمہ پڑھ لیا اور آدمی مؤمن ہو گیا، کیونکہ ہمیں تو حکم ہے کہ اگر کوئی زبان سے کلمہ پڑھ لے تو تم اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرو، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ صرف زبانی کلمہ پڑھ لینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت پورا ہوتا ہے جب زبان سے جو بات کہہ رہے ہو وہ بات دل میں بھی یقین کے ساتھ جاگزیں ہو۔ مثلاً اگر زبان سے تو یہ کہہ رہے ہو کہ "محمد رسول اللہ" کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں، لیکن دل میں العیاذ باللہ، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ نہیں ہے کہ ہم آپ کا حکم مانیں گے اور آپ کی تعلیمات پر عمل کریں گے یا مثلاً زبان سے تو یہ کہہ رہے ہو کہ "لا الہ الا اللہ" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کی جائے اور عملاً تم دوسروں کی اطاعت کرتے پھر رہے ہو تو محض زبانی کلمہ پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ کی نظر میں تم مؤمن نہیں ہو سکتے۔

سلوک مسلمانوں جیسا ہوگا

دیکھیے! جہاں تک دنیا میں کسی کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کرنا ہے، تو اس کے بارے میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم دلوں کو کُرید کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے؟ لہٰذا ہمیں تو یہ حکم ہے کہ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور بظاہر اُس کے عقائد میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، تو اس صورت میں ہم اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کریں گے۔ جیسا کہ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں منافقین کی بہت بڑی تعداد تھی، جو زبان سے اسلام لے آئے تھے، لیکن حقیقت میں ایمان نہیں لائے تھے، دل میں ایمان نہیں تھا، اسی لیے وہ طرح طرح کی سازشیں اسلام کے خلاف کرتے رہتے تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے، وہ لوگ زبان سے مسلمان تھے، دل سے مسلمان نہیں تھے، ان کو منافقین کہا جاتا ہے۔

ایسا اسلام قبول نہیں

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اگرچہ یہ دل سے مؤمن نہیں، لیکن چونکہ زبان سے اقرار کررہے ہیں، لہٰذا تم ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرو، چنانچہ جب ان میں سے کوئی مرجاتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی نماز جنازہ بھی پڑھتے تھے اور جب کوئی ملتا تو سلام کرتے اور ان کے سلام کا جواب دیتے، ان کے اسلامی حقوق ادا کرتے تھے، لیکن قرآنِ کریم اس بیان سے بھرا ہوا ہے کہ یہ منافقین جہنم میں جائیں گے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ [1]

یقین جانو منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

بہر حال! دنیاوی احکام کے اعتبار سے اگر چہ ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جارہا ہو، لیکن آخرت کے احکام کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ان کا ایمان ہمارے نزدیک معتبر نہیں، کیونکہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے، ان کے دل کے اندر ایمان موجود نہیں، لہٰذا آخرت میں ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا جیسے کافروں کے ساتھ ہوتا ہے۔

دل میں ایمان نہ ہونے کی دلیل

بہرحال! ان آیات میں ان اعرابیوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم حقیقت میں ایمان نہیں لائے ہو، اگر چہ تم نے زبان سے اقرار ضرور کرلیا ہے، لیکن ابھی تک تمہارے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ تم اسلام لانے کے بعد یہ مطالبات کرتے ہو کہ چونکہ ہم مسلمان ہوگئے ہیں، لاؤ ہمیں اتنے پیسے دو، لاؤ ہمیں فلاں سہولت مہیا کرو، فلاں فائدہ ہمیں پہنچنا چاہیے اور اگر وہ فائدہ تمہیں نہیں پہنچتا تو کہتے ہو کہ ہمارے اسلام لانے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بظاہر جو اسلام قبول کیا ہے وہ اس لیے قبول کیا ہے کہ اس کے ذریعے دنیا کا کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے، اللہ کو راضی کرنا پیشِ نظر نہیں تھا، اگر اللہ کو راضی کرنا پیشِ نظر ہوتا تو یہ باتیں نہ کرتے کہ اسلام لانے سے کیا فائدہ ہوا؟

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۴۵)۔

اسلام کے بعد ظلم وستم کا سامنا

جب انسان ایمان لاتا ہے تو اس وجہ سے لاتا ہے کہ ایک حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لاتا ہے، نبی کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں پہنچتا؟ اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ دیکھیے! کتنے مسلمان ایسے ہیں جو ایمان لائے، لیکن ایمان لانے کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کو دنیاوی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ ان کو بڑے ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا، ان کو پتھروں پر لٹایا جارہا ہے، ان کو کوڑے مارے جارہے ہیں، ان کا کھانا پینا بند کیا جارہا ہے، یہ ساری باتیں ایمان لانے والوں کے ساتھ ہوئیں، لیکن اُن سب باتوں کے باوجود ان کے ایمان میں اور قوت پیدا ہوتی چلی گئی، یہ وہ لوگ تھے جو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تھے اور تم ایمان لانے کے بعد جو یہ کہہ رہے ہو کہ ہمیں فائدہ نہیں پہنچا تو بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے ذہنوں میں تو دنیاوی فائدے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی ایمان تمہارے دلوں کے اندر نہیں ہے، بس دنیاوی مفادات کی خاطر تم نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔

دین پر چلنے سے ابتداءً آزمائش آتی ہے

ایک اور جگہ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، بہت سے لوگوں کے دلوں میں بعض اوقات اس قسم کے خیالات آنا شروع ہوجاتے ہیں، جب وہ لوگ دین کی طرف اور اسلامی احکام پر عمل کرنا شروع کرتے ہیں تو بعض اوقات ان پر کچھ آزمائشیں آتی ہیں، کبھی کوئی پریشانی کھڑی ہوگئی، کوئی بیماری آ گئی،

روزگار چھوٹ گیا، آمدنی میں کمی ہوگئی، آدمی مقروض ہوگیا وغیرہ، یہ آزمائشیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں، کسی پر کسی قسم کی آزمائش، کسی پر کسی قسم کی آزمائش، ان آزمائشوں کی وجہ سے یہ سمجھنا کہ چونکہ میں دین کی طرف چلا تھا تو دین پر چلنے کے نتیجے میں یہ پریشانیاں میرے اوپر آئی ہیں یاد رکھیے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، ان پریشانیوں کی وجہ سے دین سے برگشتہ ہونے کا کوئی جواز نہیں، بلکہ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرو اور اللہ تعالیٰ سے مانگو یا اللہ! مجھے یہ پریشانی آگئی ہے، اپنی رحمت سے دور فرمادیجیے، لیکن اس کی وجہ سے دین سے برگشتہ ہوجانا بڑی ناحقیقت شناسی کی بات ہے۔

کنارے پر کھڑے ہوکر عبادت کرنے والے

ایک اور جگہ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ قف خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (۱)

فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک کنارے پر کھڑے ہوکر کرتے ہیں، کنارے پر کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کی عبادت کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوگیا تب تو وہ مطمئن ہیں کہ اچھا ہوا کہ ہم مسلمان ہوگئے اور اللہ کی عبادت شروع کردی، کیونکہ دنیاوی فائدہ ہمیں حاصل ہوگیا، لیکن اگر اسلام لانے اور اللہ کی عبادت

---

(۱) سورۃ الحج آیت (۱۱)۔

کرنے کے نتیجے میں کوئی فتنہ یا آزمائش پیش آجائے تو وہ لوگ الٹے منہ واپس چلے جاتے ہیں کہ اسلام لانا اور عبادت کرنا ہمیں موافق نہیں آیا، اس لیے کہ اس کی وجہ سے مجھے دنیاوی نقصانات پیش آگئے، اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرمارہے ہیں کہ ایسے لوگ دنیا میں بھی خسارے میں ہیں اور آخرت میں بھی خسارے میں ہوں گے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ کی کوئی اطاعت اور عبادت اس وجہ سے نہ کرو کہ اس کا کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوگا، اگر اللہ تعالیٰ کوئی دنیاوی فائدہ دے دیں تو یہ ان کا کرم ہے، لیکن تم جو کوئی عبادت کرو، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کرو، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرو، دنیاوی فائدے کے لیے مت کرو، ایک سبق تو اس آیتِ کریمہ نے یہ دیا۔

ایمان لانے کا تقاضا

دوسرا سبق اس آیت نے یہ دیا کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [1]

یعنی صحیح معنوں میں مؤمن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد پھر کسی شک وشبہے میں نہیں پڑتے، چونکہ مجھے اسلام لانے کے بعد نقصان ہوگیا، اس لیے مجھے شک ہوگیا کہ اسلام برحق ہے یا نہیں؟ بلکہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان سے بھی اور اپنے مال کے ذریعے بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ''جہاد'' کے معنی ہیں کوشش اور جدوجہد، جس طرح

---

(۱) سورۃ الحجرات آیت (۱۵)۔

بھی ممکن ہو، اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ ایمان لانے کے بعد ایک تقاضا سچے ایمان کا یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے جان و مال سے اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے جدوجہد کرے۔

اسلام لانے اور نیک عمل کرنے پر احسان نہ جتلاؤ

اور تیسرا اور آخری سبق جو ان آیاتِ کریمہ نے دیا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی صحیح معنی میں بھی ایمان لائے تو اپنے اسلام لانے کا کسی پر احسان نہ جتلائے اور جو حکم اسلام لانے کا ہے وہی حکم ہر نیک کام کرنے کا ہے، جو نیک کام کرو، وہ اللہ کے لیے کرو، اپنی آخرت سنوارنے کے لیے کرو، ثواب حاصل کرنے کے لیے کرو اور اس کام کا کسی پر احسان نہ جتلاؤ کہ میں نے یہ کردیا، احسان جتلانے سے اس نیکی کے برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ دیکھیے! قرآنِ کریم(۱) میں صدقہ کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے، لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ صدقہ قابلِ قبول ہے جو کچھ تم نے صدقے میں پیسے خرچ کیے ہیں، اس کے بعد کسی پر احسان نہ جتلائیں اور کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، تب وہ صدقہ مقبول ہے، لیکن اگر صدقہ بھی کیا اور ساتھ میں احسان بھی جتاتے رہے کہ میں یہ کرتا ہوں، میں یہ کرتا ہوں، ارے تم کیا احسان جتاتے ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اس نیک عمل کی توفیق دے دی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نہ ہوتی تو اس نیک عمل سے محروم رہتے، لہٰذا چاہے تم نے کتنی بڑی نیکی کرلی ہو، کتنا بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہو، لیکن اس کا احسان اللہ پر اور اللہ کے رسول

---

(۱) ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ آیت (٢٦٤).

پر اور مسلمانوں پر نہ جتلاؤ، بلکہ شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے اپنے فضل سے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرمادی، لہٰذا احسان جتلانے کا کوئی موقع نہیں۔

خلاصہ

بہرحال! ان آیات کے ذریعہ یہ سبق دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نیک عمل کی توفیق عطا فرمادے، اس کو اللہ کا کرم سمجھو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ نہ کہو کہ میں نے یہ کام کیا ہے اور اس پر احسان جتاتے پھرو، یہ تین سبق ہیں جو ان آیاتِ کریمہ نے عطا فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کی سمجھ عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
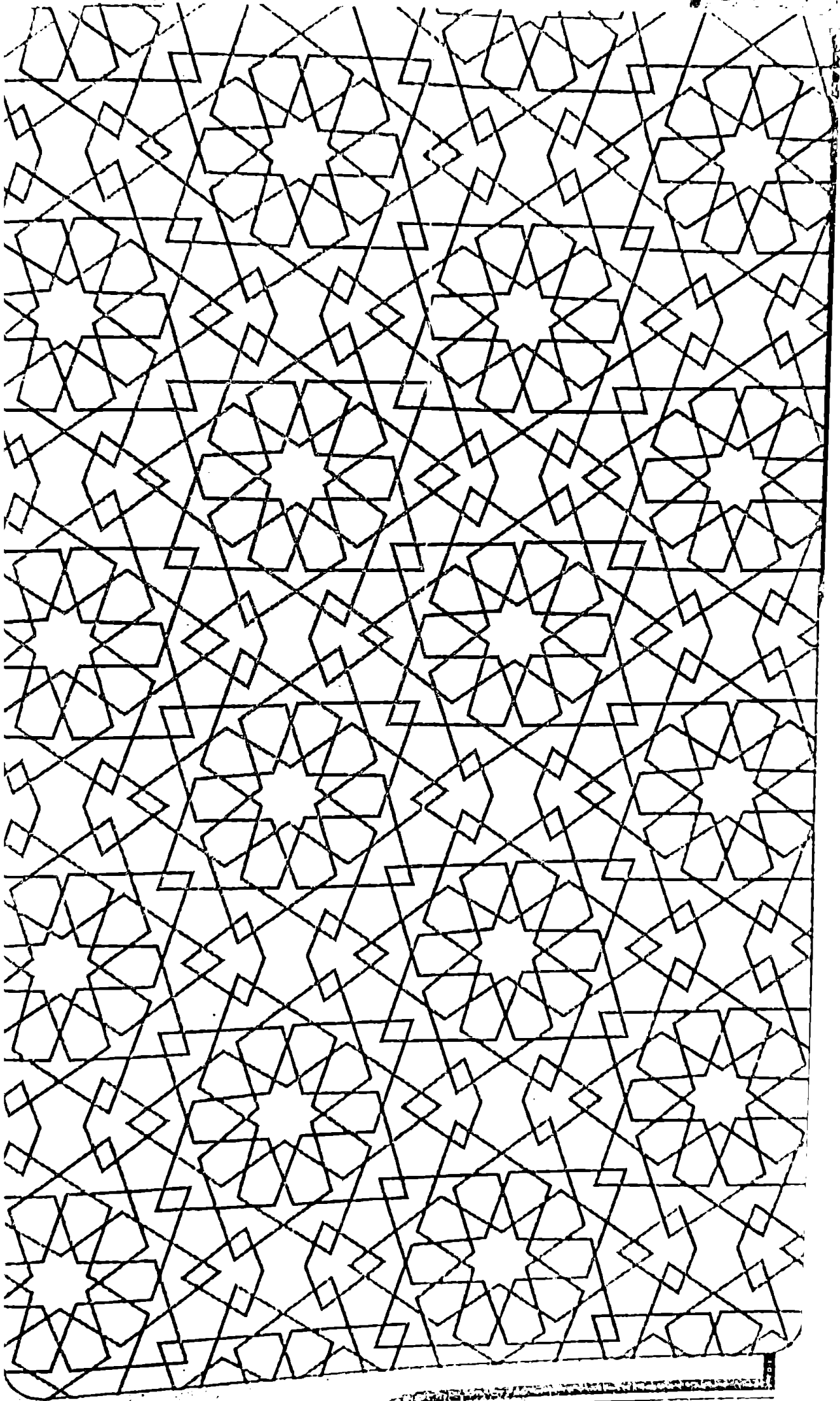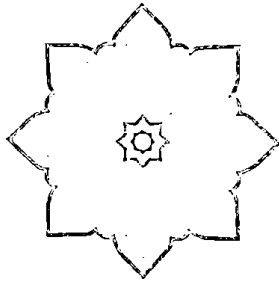
تقدیر پر راضی رہنا چاہیے

(اصلاحی خطبات ج ۷ ص ۱۹۱)
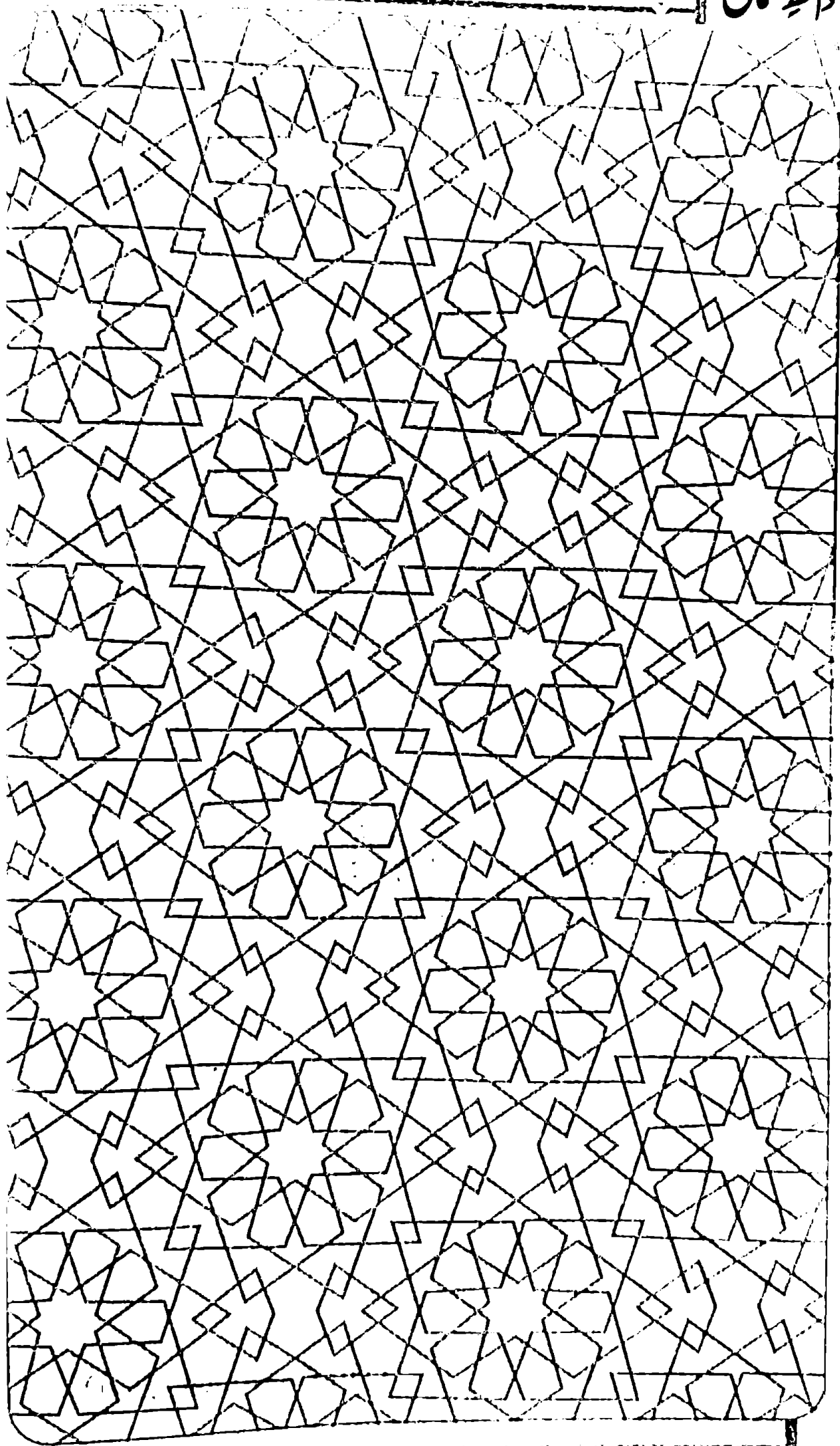
بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیر پر راضی رہنا چاہیے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: «اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ، وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْئٌ

فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَ كَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَرَ اللّٰهُ وَ مَاشَاءَ فَعَلَ، فَاِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ»(١).

اٰمنت باللّٰه صدق اللّٰه مولانا العظیم، وصدق رسوله النبی الکریم، ونحن علی ذالك من الشاھدین والشاکرین، والحمد للّٰه رب العالمین۔

دنیا کی حرص مت کرو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''ان کاموں کی حرص کرو جو تم کو نفع پہنچانے والے ہیں۔'' مقصد یہ ہے کہ وہ اعمال اور وہ افعال جو آخرت میں نفع کا سبب بن سکتے ہیں ان کے اندر حرص کرو۔ دیکھیے! ویسے تو حرص بری چیز ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے کہ مال کی حرص، دنیا کی حرص، شہرت کی حرص، نام ونمود کی حرص، دولت کی حرص مت کرو، انسان کے لیے یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ ان چیزوں کی حرص کرے، بلکہ ان تمام چیزوں میں قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور فرمایا گیا کہ ان میں سے جو کچھ تمہیں جائز طریقے سے کوشش کرنے کے نتیجے میں مل رہا ہے اس پر قناعت کرو اور یہ سمجھو کہ میرے لیے یہی بہتر تھا۔ مزید کی حرص کرنا کہ مجھے اور زیادہ مل جائے، یہ درست نہیں، اس حرص سے بچو، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی ساری خواہشات کبھی پوری نہیں کرسکتا۔

''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد''

(١) صحیح مسلم ٢٠٥٢/٤ (٢٦٦٤)۔

بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ میری ساری خواہشات پوری ہوگئی ہیں، بلکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر ابنِ آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو مل جائیں، جب دو مل جائیں گی تو پھر خواہش کرے گا کہ تین ہوجائیں اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔[1] جب قبر میں جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھرے گی، دنیا کے اندر کوئی چیز اس کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ البتہ ایک چیز ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ وہ ہے ''قناعت'' یعنی جو کچھ اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز اور حلال طریقے سے دے دیا ہے، اس پر قناعت کرلے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کے سوا پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دین کی حرص پسندیدہ ہے

لہٰذا دنیا کی چیزوں میں حرص کرنا برا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن دین کے کاموں میں، اچھے اعمال میں، عبادات میں حرص کرنا اچھی چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص نیک کام کررہا ہے، اس کو دیکھ کر یہ حرص کرنا کہ میں بھی یہ نیک کام کروں یا فلاں شخص کو دین کی نعمت حاصل ہے مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہوجائے۔ ایسی حرص مطلوب ہے اور محبوب و پسندیدہ ہے۔ اس لیے اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایسے کاموں کی حرص کرو جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں اور قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ [2]

---

(۱) صحيح البخاری ۹۲/۸ (٦٤٣٦) و (٦٤٣٨) و (٦٤٣٩)۔

(۲) سورة البقرة آيت (١٤٨) وسورة المائدة آيت (٤٨)۔

یعنی نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور آپس میں مسابقت کرو۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نیک کاموں کی حرص

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نیکیوں میں بڑے حریص تھے، ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ہمارے نامۂ اعمال میں نیکی کا اضافہ ہوجائے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوتو اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے اور اگر اس کے دفن میں بھی شریک رہے تو اس کو دو قیراط اجر ملتا ہے۔''(۱)

''قیراط'' اُس زمانے میں سونے کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھانے کے لیے قیراط کا لفظ بیان فرما دیا، پھر خود ہی فرمایا کہ آخرت کا وہ قیراط اُحد پہاڑ سے بھی بڑا ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ قیراط سے دنیا والا قیراط مت سمجھ لینا، بلکہ آخرت والا قیراط مراد ہے جو اپنی عظمتِ شان کے لحاظ سے اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہے، اور یہ بھی اس اجر کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس لیے کہ پورا بیان تو انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کی لغت اس کے بیان کے لیے ناکافی ہے۔ اس واسطے یہ الفاظ استعمال فرمائے تاکہ ہماری سمجھ میں

---

(۱) صحیح البخاری ۲/۸۷ (۱۳۲۳) وصحیح مسلم ۲/۶۵۲ (۹۴۵)۔

آ جائے۔ بہرحال! حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب یہ حدیث سنی تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا واقعتاً آپ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: افسوس! ہم نے اب تک بہت سے قیراط ضائع کردیے۔ اگر پہلے سے یہ حدیث سنی ہوتی تو ایسے مواقع کبھی ضائع نہ کرتے۔

تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی حال تھا کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

یہ حرص پیدا کریں

ہم اور آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ ثواب ہے، فلاں عمل کا یہ ثواب ہے۔ یہ درحقیقت اس لیے بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں میں ان اعمال کو انجام دینے کی حرص پیدا ہو۔ فضیلت والے اعمال، نوافل، مستحبات اگرچہ فرض و واجب نہیں، لیکن ایک مسلمان کے دل میں ان کی حرص ہونی چاہیے کہ وہ ہمیں حاصل ہوجائیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دین کی حرص عطا فرماتے ہیں تو ان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوڑ لگانا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دعوت میں تشریف لے جارہے تھے۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ

تھیں، پیدل سفر تھا۔ راستے میں ایک جنگل اور میدان پڑتا تھا اور بے پردگی کا احتمال نہیں تھا، اس لیے وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ہاں! دوڑ لگاؤ گی؟ اس دوڑ لگانے سے ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دلجوئی مقصود تھی اور دوسری طرف اُمت کو یہ تعلیم دینی تھی کہ بہت زیادہ بزرگ اور نیک ہوکر ایک کونے میں بیٹھ جانا بھی اچھی بات نہیں، بلکہ دنیا میں آدمیوں کی طرح اور انسانوں کی طرح رہنا چاہیے اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے ساتھ دو مرتبہ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ جب دوڑ لگائی تو چونکہ اس وقت آپ کا جسم نسبتاً بھاری ہوگیا تھا اس لیے میں آگے نکل گئی اور آپ پیچھے رہ گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: ''تلك بتلك'' یعنی دونوں برابر ہوگئے۔ ایک مرتبہ تم جیت گئیں اور ایک مرتبہ میں جیت گیا۔(۱) اب دیکھیے کہ بزرگانِ دین اس سُنّت پر کس طرح عمل کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس سُنّت پر عمل

ایک مرتبہ حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ تھانہ بھون سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں دعوت میں تشریف لے جارہے تھے

---

(۱) سنن ابی داود ۲۹/۳ (۲۵۷۸) ومسند الحمیدی ۲۸۹/۱ (۲۶۳) طبع دار السقا بیروت۔ ومسند اسحاق بن راھویہ ۲۸۹/۲ (۸۰۶) مکتبۃ الایمان. والحدیث سکت عنہ أبو داود، وقال المنذری فی ''مختصرہ'' ۱۶۸/۲ (۲۵۷۸): وأخرجہ النسائی وابن ماجہ، طبع مکتبۃ المعارف، الریاض.

اور اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔ جنگل کا پیدل سفر تھا، کوئی اور شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا کہ الحمد للہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوگئی ہے، لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کی سنت پر ابھی تک عمل کا موقع نہیں ملا۔ آج موقع ہے کہ اس سنت پر بھی عمل ہوجائے، چنانچہ اس وقت آپ نے دوڑ لگا کر اس سنت پر بھی عمل کرلیا۔ اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانے کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کے لیے دوڑ لگائی۔ یہ ہے اتباعِ سنت کی حرص، نیک کاموں کی حرص، اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ حرص پیدا فرمادے۔ آمین۔

ہمت بھی اللہ سے مانگنی چاہیے

اب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں ایک نیک کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص یہ عبادت کرتا ہے، میں بھی یہ عبادت انجام دوں، لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ عبادت اور یہ نیک کام ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم نہیں کر پائیں گے، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تو جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو تو اس وقت کیا کریں؟ اس کے لیے حدیث کے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ

"واستعن باللّٰہ ولا تعجز"

یعنی ایسے واقعات میں مایوس اور عاجز ہوکر نہ بیٹھ جائے کہ مجھ سے یہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے اور کہے کہ یا اللہ! یہ کام میرے بس میں تو نہیں ہے، لیکن آپ کی قدرت میں ہے۔ آپ ہی مجھے

اس نیک کام کی توفیق عطا فرمادیں اور اس کے کرنے کی ہمّت عطا فرمادیں۔

مثلاً نیک لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھا کرتے ہیں اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں تو اب دل میں شوق پیدا ہوا کہ مجھے بھی رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہیے، لیکن یہ خیال بھی آیا کہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھنا میرے بس میں نہیں۔ چلو چھوڑو اور مایوس ہوکر بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یااللہ! میری آنکھ نہیں کھلتی، میری نیند پوری نہیں ہوتی یااللہ! تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمادیجیے اور اس کی فضیلت عطا فرمادیجیے۔

عمل کی توفیق یا اجر وثواب

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور توفیق مانگے گا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو واقعتاً اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے اور اگر اس عمل کی توفیق حاصل نہ ہوئی تو یقیناً اس نیک عمل کا ثواب ان شاء اللہ ضرور حاصل ہوجائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے اور یہ کہے کہ یااللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما تو اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمادیتے ہیں، اگرچہ بستر پر ہی اس کا انتقال ہوجائے۔(۱)

(۱) صحیح مسلم ۱۵۱۷/۳ (۱۹۰۹) وسنن ابی داود ۸۵/۲ (۱۵۲۰)۔

ایک لوہار کا واقعہ

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہو گیا تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھا تو پوچھا کہ حضرت! کیسی گزری؟ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم کا معاملہ فرمایا اور مغفرت فرمادی اور استحقاق کے بغیر بڑا درجہ عطا فرمایا، لیکن جو درجہ میرے سامنے والے مکان میں رہنے والے لوہار کو نصیب ہوا وہ مجھے نہیں مل سکا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو اس کو یہ جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا؟ جس کی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا، چنانچہ وہ حضرت عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں گیا اور پوچھا کہ یہاں کوئی لوہار رہتا تھا جس کا انتقال ہو گیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں اس سامنے والے مکان میں لوہار رہتا تھا اور چند روز پہلے ہی اس کا انتقال ہوا ہے، چنانچہ یہ لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے اپنا خواب بیان کیا اور پوچھا کہ تمہارا شوہر ایسا کون سا عمل کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا؟ لوہار کی بیوی نے بتایا کہ میرا شوہر ایسی کوئی خاص عبادت تو نہیں کرتا تھا۔ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا، البتہ میں نے اس کے اندر دو باتیں دیکھیں۔ ایک یہ کہ جب لوہا کوٹنے کے دوران اذان کی آواز ''اللہ اکبر'' کان میں پڑتی تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اپنا ہتھوڑا کوٹنے کے لیے اوپر اُٹھالیا ہوتا اور اتنے میں اذان کی آواز آجاتی تو وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے چوٹ لگادوں، بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا اور اُٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے سامنے والے مکان میں ایک بزرگ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مکان

کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا شوہر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی فراغت عطا فرماتے تو میں بھی عبادت کرتا۔ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا بس یہی حسرت ہے جس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھا دیا۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہے ''حسرتِ نایاب'' جو بعض اوقات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اس لیے جب کسی کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس نیک عمل کے بارے میں دل میں حرص اور حسرت پیدا ہونی چاہیے کہ کاش ہمیں بھی اس نیک کام کے کرنے کی توفیق مل جائے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر اور سوچ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی دولت مند اور مالدار ہیں۔ ان پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اس لیے کہ جو جسمانی عبادت ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں، لیکن جسمانی عبادت کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً صدقہ خیرات کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور ان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں، لہٰذا آخرت کے درجات میں وہ ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم جتنی بھی کوشش کر لیں، لیکن غریب ہونے کی وجہ سے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لیے کہ ہم صدقہ خیرات نہیں کر سکتے۔ دیکھیے ہماری اور ان کی سوچ میں کتنا فرق ہے؟ ہم جب اپنے سے بڑے مالدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس کے

صدقہ خیرات کرنے پر ہمیں رشک نہیں آتا، بلکہ اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے پاس دولت زیادہ ہے۔ اس لیے یہ بہت مزے سے زندگی گزار رہا ہے۔ کاش کہ ہمیں بھی دولت مل جائے تو ہم بھی عیش و آرام سے زندگی گزاریں۔ یہ ہے سوچ کا فرق۔

بہرحال! ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم اس عمل کو پابندی سے کرلوگے تو صدقہ، خیرات کرنے والوں سے تمہارا ثواب بڑھ جائے گا، کوئی تم سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ وہ عمل یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ ''سبحان اللہ''، ۳۳ مرتبہ ''الحمداللہ''، ۳۴ مرتبہ ''اللہ اکبر'' پڑھ لیا کرو۔[1]

نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی ذکر مال داروں نے بھی شروع کردیا تو پھر ان صحابہ کرام کا سوال برقرار رہے گا، کیونکہ مالدار لوگ پھر ان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بتلانا چاہتے تھے کہ جب تمہیں یہ حرص اور حسرت ہورہی ہے کہ ہم بھی مالدار ہوتے تو ہم بھی اسی طرح صدقہ وخیرات کرتے جس طرح یہ مالدار لوگ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس حرص کی برکت سے تم کو صدقہ و خیرات کا اجر وثواب بھی عطا فرمادیں گے۔ بہرحال! کسی نیک کام کے کرنے کی حرص اور ارادہ اور اس کے نہ کرسکنے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے، اس لیے جب کسی شخص کے بارے میں سنو

---

[1] صحیح البخاری ۱/۱۶۸ (۸۴۳) و ۸/۷۲ (۶۳۲۹)۔

کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو تم یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! یہ نیک کام میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اس کام کے کرنے میں میری مدد فرمائیے اور مجھے اس کے کرنے کی توفیق عطا فرمائیے، تو پھر اللہ تعالیٰ یا تو اس نیک کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمادیں گے یا اس نیک کام کا اجر و ثواب عطا فرمادیں گے۔ یہ ''نسخہ کیمیا'' ہے۔

لفظ ''اگر'' شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

آگے فرمایا کہ

''وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْئٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّيْ فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَ كَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَرَ اللّٰهُ وَ مَاشَاءَ فَعَلَ، فَاِنَّ ''لَوْ'' تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ''

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کرلیتا تو ایسا نہ ہوتا اور اگر یوں کرلیتا تو ایسا ہوجاتا، یہ ''اگر'' مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت یہی تھی، جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا، اس لیے کہ یہ لفظ ''اگر'' شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہوجائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرالیتا تو یہ بچ جاتا یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہوگئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کرلیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ۔ ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لیے ہوگیا، میں اگر ہزار تدبیر کرلیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

دنیا راحت اور تکلیف سے مرکّب ہے

اس حدیث میں کیا عجیب وغریب تعلیم دی گئی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے۔ آمین۔ یقین رکھیے کہ اس دنیا میں سکون، عافیت، آرام اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان تقدیر پر یقین اور ایمان لے آئے، اس لیے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو اس دنیا میں کبھی کوئی غم اور پریشانی نہ آئی ہو یا کبھی کوئی مصیبت اس کے اوپر نہ آئی ہو۔ یہ عالمِ دنیا دونوں چیزوں سے مرکب ہے۔ جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے۔ یہاں کوئی خوشی بھی خالص نہیں، کوئی غم خالص نہیں، لہٰذا غم، تکلیف اور پریشانی تو اس دنیا میں ضرور آئے گی، اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کرکے یہ چاہو کہ کوئی تکلیف نہ آئے تو یہ نہیں ہوسکتا۔

اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں

ہماری اور تمہاری کیا حقیقت ہے! انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کی پیاری اور محبوب مخلوق ہے۔ ان کے اوپر بھی تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں اور عام لوگوں سے زیادہ آتی ہیں، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

”اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الأمثل فالأمثل“[1]

[1] السنن الکبریٰ للنسائی ٤٧/٧ (٧٤٤٠) طبع موسسہ الرسالۃ ومسند البزار ٣٤٩/٣ (١١٥٠) طبع مکتبۃ العلوم والحکم. وسنن الترمذی ٢٠٣/٤ (٣٩٨) وقال ھذا حدیث حسن صحیح.

یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں اور پھر جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا قریب ہوگا اس کو اتنی ہی زیادہ تکالیف اور پریشانیاں آئیں گی، وہ عالم جہاں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں آئے گی، وہ عالم جنت ہے، لہٰذا اس دنیا میں پریشانیاں تو آئیں گی، لیکن اگر ان تکالیف پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہائے یہ کیوں ہوا؟ اگر ایسا کر لیتے تو یہ نہ ہوتا۔ فلاں وجہ اور سبب کے ایسا ہوگیا۔ ایسا سوچنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے حسرت بڑھتی ہے، تکلیف اور صدمہ بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر شکوہ پیدا ہوتا ہے کہ ـ معاذ اللہ ـ یہ ساری مصیبتیں میرے مقدر میں رہ گئی تھیں، وغیرہ اور وہ مصیبت وبالِ جان بن جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی تکلیف ہوئی اور اس شکوہ کی وجہ سے آخرت میں اس پر عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے اور بعض اوقات ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے

اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ جب تمہیں کوئی پریشانی یا تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے پیش آیا ہے۔ میں اس کی حکمت کیا جانوں؟ اللہ تعالیٰ ہی اس کی حکمت اور مصلحت جانتے ہیں۔ ایک حقیر کیڑا اس کی حکمت اور مصلحت کو کیا جانے، البتہ اس تکلیف پر رونا آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ تکلیف پر رونا نہیں چاہیے۔ یہ بات غلط ہے۔ اس لیے کہ تکلیف پر رونا بُرا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر شکوہ نہ ہو۔

ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب ان سے ملنے گئے، دیکھا کہ وہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا تکلیف ہے؟ جس کی وجہ سے آپ رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کوئی بچے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے تو بچے روتے ہیں، آپ تو بڑے ہیں، پھر بھی رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا: تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ کو میرا رونا دیکھنا ہی مقصود ہو، اس وجہ سے وہ مجھے بھوکا رکھ رہے ہیں۔ تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو رونا بھی پسند آتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ شکوہ شکایت نہ ہو۔ اسی کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ''تفویض'' کہا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا اور یہ کہنا کہ اے اللہ! مجھے ظاہری طور پر تکلیف ہو رہی ہے، لیکن فیصلہ آپ کا برحق ہے۔ اگر انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں تو اس یقین کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے گا اور بیماری اور پریشانی کے وقت جو ناقابلِ برداشت صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے وہ نہیں ہوگی۔

مسلمان اور کافر کا امتیاز

ایک کافر کا عزیز بیمار ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے علاج کرایا، ڈاکٹر کے علاج کے دوران اس کا انتقال ہو گیا۔ تو اب اس کافر کے پاس اطمینان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ ڈاکٹر نے دوا صحیح تجویز نہیں کی، صحیح

دیکھ بھال نہیں کی، اس لیے یہ مرگیا۔ اگر علاج صحیح ہوجاتا تو یہ نہ مرتا، لیکن ایک مسلمان کا عزیز بیمار ہوا، ڈاکٹر نے علاج کیا، لیکن اس کا انتقال ہوگیا تو اب اس مسلمان کے پاس اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا ذریعہ موجود ہے، وہ یہ کہ اگرچہ اس کی موت کا ظاہری سبب ڈاکٹر کی غفلت ہے، لیکن جو کچھ ہوا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا۔ ان کے ارادے سے موت واقع ہوئی۔ اگر ڈاکٹر صحیح دوا دیتا تب بھی وہ دوا اُلٹی پڑجاتی اور اگر میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا، تب بھی موت آتی۔ اس لیے کہ ہونا وہی تھا جو تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا۔ اس کی موت کا وقت آچکا تھا۔ اس کے دن پورے ہوگئے تھے۔ اس کو تو جانا تھا، اس لیے چلا گیا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر برحق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کا کوئی انگارہ اپنی زبان پر رکھ لوں اور اس کو چاٹوں، یہ عمل مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسے واقعے کے بارے میں جو ہوچکا یہ کہوں کہ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا اور کسی ایسے واقعے کے بارے میں جو نہیں ہوا یہ کہوں کہ کاش! وہ واقعہ ہوجاتا۔ (۱)

اللہ کے فیصلے پر راضی رہو

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ

(۱) الزهد والرقائق لابن المبارك ۳۱/۲. طبع دار الكتب العلمية.

ہوتا تو اچھا تھا یا یہ کہنا کہ ایسا ہوجاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے۔ ایک مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے اور تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو اور نہ دل میں اس کی برائی ہو، بلکہ دل و جان سے اس پر راضی رہے۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

"إِذَا قَضَى اللّٰهُ قَضَاءً أَحَبَّ أَنْ يُرْضَى بِقَضَائِه"(۱)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جانا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو اور اس فیصلے کو بے چون و چرا تسلیم کرے۔

یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے۔ اب پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کر لیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ ایسا کہنے سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جو واقعہ پیش آیا وہ تو پیش آنا ہی تھا۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی۔ تم اگر ہزار تدبیر بھی کر لیتے، تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا، لہٰذا اب یہ باتیں کرنا کہ ایسا کر لیتے تو ایسا ہوجاتا۔ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں۔ ایسی باتیں کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

---

(۱) الزہد والرقائق لابن المبارک ۳۲/۲ طبع دار الکتب العملیة۔ والرضاء عن الله بقضاءه لابن ابی الدنیا ص ٤٧(٦) طبع دار السلفية۔

رضاء بالقضاء میں تسلی کا سامان ہے

حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جائے تو انسان کے پاس "رضا بالقضاء" تقدیر پر راضی ہونے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ اس لیے کہ تمہارے ناراض ہونے سے وہ فیصلہ بدل نہیں سکتا، جو غم پیش آیا ہے تمہاری ناراضگی سے وہ غم دور نہیں ہوسکتا، بلکہ اس ناراضگی سے غم کی شدت اور تکلیف میں مزید اضافہ ہوجائے گا اور یہ کہے گا کہ ہائے ہم نے یہ نہ کرلیا، فلاں تدبیر اختیار نہ کرلی۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ رضا بالقضاء میں درحقیقت انسان کی تسلی کا سامان ہے، ایک مؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو تسلی کا ذریعہ بنادیا ہے۔

تقدیر "تدبیر" سے نہیں روکتی

اور یہ "تقدیر" عجیب وغریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اس عقیدے کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعے کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ مثلاً تقدیر کا بہانہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ یہ عمل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے، بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے اس کو اختیار کرو۔ اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعے کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ پیش آ چکا، تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، ہم اس پر راضی ہیں، لہٰذا واقعہ پیش آ چکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کرلیتا تو یوں ہوجاتا۔ یہ بات ''عقیدۂ تقدیر'' کے خلاف ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ہمیں راہِ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لیے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہوجاتا تھا۔ اس طاعون میں ہزارہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے ہیں۔ آج بھی اردن میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے۔ بہرحال! حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمن بن

عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ "اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ اس علاقے کے اندر داخل نہ ہوں اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں وہ وہاں سے نہ بھاگیں۔" یہ حدیث سن کر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہیے، لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس وقت ایک صحابی غالباً حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"اتفرّ من قدر الله؟"

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعے موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آ کر رہے گی اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ جواب میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لو غيرك قالها يا أبا عبيدة"

اے ابوعبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو پوری حقیقت سے آگاہ ہیں۔ آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ

"نعم! نفر من قدر الله الیٰ قدر الله "(۱)

"ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

---

(۱) صحیح البخاری ۱۳۰/۷ (۵۷۲۹) و صحیح مسلم ۱۷٤۰/٤ (۲۲۱۹)۔

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا ''عقیدۂ تقدیر'' کے خلاف نہیں، بلکہ ''عقیدۂ تقدیر'' کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جارہے ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لیے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے، لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی ہے۔

''تقدیر'' کا صحیح مفہوم

تقدیر کا صحیح مفہوم یہ ہے ایک مؤمن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا اور یہ کہہ دیا کہ یااللہ ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کرلی، اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا، ہم اس پر راضی رہیں گے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لہٰذا واقعے کے پیش آنے سے پہلے عقیدۂ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ جیسے بعض لوگ عقیدۂ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنالیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہوکر رہے گا، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو، لیکن ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آجائے تو اس پر راضی رہو، لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت بُرا ہوا تو

اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جو واقعہ پیش آچکا ہے۔ وہ بدل نہیں سکتا اور آخر کار تمہیں سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس لیے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

غم اور صدمہ کرنا ''رضا بالقضاء'' کے منافی نہیں

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے یا کوئی غم یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں اور گناہ نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے، رونا بھی جائز اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہوں اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اس لیے غم اور صدمہ بھی ہے، اس غم اور صدمے کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے۔ حکمت پر مبنی ہے، لہٰذا ''رضا'' سے مراد رضاءِ عقلی ہے۔ یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً ایک مریض ایک ڈاکٹر سے آپریشن کرانے کے لیے ہسپتال جاتا ہے اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے، اس کی خوشامد کرتا ہے کہ میرا آپریشن کردو۔ جب ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اب یہ رو رہا ہے۔ چیخ رہا ہے، ہائے ہائے کررہا ہے، اس تکلیف کی وجہ سے اس کو رنج اور صدمہ بھی ہورہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر کو آپریشن کی فیس بھی دیتا ہے، اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر کررہا ہے، وہ ٹھیک کررہا ہے اور میرے فائدے کے لیے کررہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن کو اس دنیا میں جتنی تکلیفیں اور جتنے صدمے پہنچتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا آپریشن کررہے ہیں۔ اب اگر ان تکالیف کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کررہے ہو تو اس کا انجام تمہارے حق میں بہتر ہونے والا ہے، لہٰذا عقلی طور پر اگر یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی ہے اور پھر انسان اس صدمے اور اس تکلیف پر اظہارِ غم کرے، روئے، چلّائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک تاجر شخص اس بات کی کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ میرا فلاں سودا ہوجائے تو اس کے ذریعے میں بہت نفع کمالوں گا یا ایک شخص کسی عہدے اور منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے فلاں منصب مل جائے تو بڑا اچھا ہو، اب اس سودے کے لیے

یا اس منصب کے لیے بھاگ دوڑ اور کوشش کررہا ہے، دعائیں کررہا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کرارہا ہے، لیکن جب سب کام مکمل ہوچکے اور قریب تھا کہ وہ سودا ہوجائے یا وہ عہدہ اور منصب اس کو مل جائے، عین اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا یہ نادان اور بے وقوف بندہ اس سودے یا منصب کے حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اپنی پوری کوشش صرف کررہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ سودا یا یہ منصب اس کو حاصل ہوگیا تو اس سودے یا اس عہدے کے نتیجے میں یہ گناہ میں مبتلا ہوگا، اس کے نتیجے میں مجھے اس کو جہنم میں دھکیلنا پڑے گا۔ اس لیے یہ منصب یہ سودا اس سے دور کردیا جائے، چنانچہ عین اُس وقت جب کہ وہ سودا ہونے والا تھا یا وہ عہدہ ملنے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہوگئی اور وہ سودا نہیں ہوا یا وہ عہدہ نہیں ملا۔ اب یہ شخص رو رہا ہے اور یہ شکایت کررہا ہے کہ فلاں شخص نے بیچ میں آکر میرا کام بگاڑ دیا۔ اب اس بگاڑ کو دوسروں کی طرف منسوب کررہا ہے، حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ کیا وہ اس کے خالق اور مالک نے کیا ہے، اس کے فائدے کے لیے کیا، کیونکہ اگر عہدہ مل جاتا تو جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا۔ یہ ہے تقدیر اور اللہ کا فیصلہ، جس پر عقلی طور پر انسان کو راضی ہونا چاہیے۔

تقدیر کے عقیدے پر ایمان لاچکے ہو

عقیدے کے اعتبار سے تو ہر مؤمن کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے۔ جب ایک بندہ ایمان لاتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے:

''اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی''

لیکن اس ایمان کا اثر عموماً اس کی زندگی پر ظاہر نہیں ہوتا اور اس عقیدے کا استحضار نہیں رہتا اور اس کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں پریشان ہوتا رہتا ہے، اس لیے صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب تم اس عقیدے پر ایمان لے آئے تو اس عقیدے کو اپنی زندگی کا جزو بناؤ، اس عقیدے کا دھیان پیدا کرو، اس کو یاد رکھو اور جو بھی واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو تازہ کرو کہ میں اللہ کی تقدیر پر ایمان لایا تھا، اس لیے مجھے اس پر راضی رہنا چاہیے۔ یہی فرق ہے ایک عام آدمی میں اور اس شخص میں جس نے صوفیاءِ کرام کے زیرِ تربیت اس عقیدے کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی ہو، لہٰذا اس عقیدے کو اس طرح حال بنالیں کہ جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس وقت ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھے اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ آگے ہمیں اس کے اندر چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس کی مشق کرنی پڑتی ہے، تب جاکر یہ عقیدہ حال بنتا ہے اور جب یہ حال بن جاتا ہے تو پھر ایسے شخص کو دنیا میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس عقیدے کو ہم سب کا حال بنادے۔ آمین۔

یہ پریشانی کیوں ہے؟

دیکھیے صدمہ اور غم اور چیز ہے، یہ تو ہر شخص کو پیش آتی ہے، لیکن ایک ہے

پریشانی وہ یہ کہ آدمی اس غم اور صدمے کی وجہ سے بے تاب اور بے چین ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آرہا ہے یہ پریشانی کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ شخص اس فیصلے پر عقلی طور پر راضی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو چین اور سکون کیسے میسر آئے؟ اور جس شخص کا اس بات پر ایمان ہے کہ میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے میرے اختیار سے باہر تھا، اس لیے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، ایسے شخص کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ غم اور صدمہ ضرور ہوگا، لیکن پریشانی نہیں ہوگی۔

آبِ زر سے لکھنے کے قابل جملہ

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مجھے اس پر بہت شدید صدمہ ہوا، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ کبھی پیش نہیں آیا تھا اور یہ صدمہ بے چینی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، کسی کروٹ کسی حال قرار نہیں آرہا تھا، اس صدمے پر رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ اس لیے کہ بعض اوقات رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ اس وقت میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہٗ کو اپنی یہ کیفیت لکھی تو انہوں نے جواب میں صرف یہ ایک جملہ لکھ دیا اور الحمد للہ آج تک وہ جملہ دل پر نقش ہے، اس ایک جملے نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا، وہ جملہ یہ تھا:

> ''صدمہ تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن غیر اختیاری اُمور پر اتنی زیادہ پریشانی قابلِ اصلاح ہے۔''

یعنی صدمہ تو اپنی جگہ ہے، وہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ عظیم باپ کی جدائی

ہوگئی، لیکن یہ ایک غیر اختیاری واقعہ پیش آیا، اس لیے تم یہ نہیں کر سکتے تھے کہ موت کے وقت کو ٹلا دیتے۔ اب اس غیر اختیاری واقعے پر اتنی پریشانی قابلِ اصلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رضا بالقضاء کا جو حکم ہے۔ اس پر عمل نہیں ہو رہا، اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہو رہی ہے۔ یقین جانئے اس ایک جملے کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سینے پر برف رکھ دی اور میری آنکھیں کھول دیں۔

لوحِ دل پر یہ ''جملہ'' نقش کرلیں

ایک اور موقع پر اپنے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے خط میں لکھا کہ حضرت! فلاں بات کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ لکھا کہ

''جس شخص کا اللہ جل جلالہٗ سے تعلق ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟''

یعنی پریشانی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو پھر پریشانی آنے کی مجال نہیں۔ اس لیے کہ جو صدمہ اور غم ہو رہا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے کہو یا اللہ! اس کو دور فرما دیں، پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو، لیکن پریشانی کس بات کی؟ لہٰذا اگر رضا بالقضاء حال بن جائے اور جسم و جان کے اندر داخل ہو جائے تو پھر پریشانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے راحت وسکون کا راز

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے جاکر پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ فرمایا: بڑے مزے میں ہوں اور اس شخص کے مزے کا کیا پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے، وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے، لہٰذا دنیا کے سارے کام میری مرضی کے مطابق ہورہے ہیں۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت! یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ دنیا کے تمام کام ان کی مرضی کے مطابق ہوجائیں۔ آپ کو یہ کیسے حاصل ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردیا ہے جو اللہ کی مرضی، وہ میری مرضی اور دنیا کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہورہے ہیں تو میرے مزے کا کیا پوچھنا۔ پریشانی تو میرے پاس بھی نہیں بھٹکتی، پریشانی تو اس شخص کو ہو جس کی مرضی کے خلاف کام ہوتے ہوں[1]۔

تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو رضا بالقضاء کی دولت عطا فرمادیتے ہیں۔ ان کے پاس پریشانی کا گزر نہیں ہوتا۔ ان کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ غم اور تکالیف ان کے پاس ضرور آتی ہیں، لیکن پریشانی نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ غم یا صدمہ آرہا ہے وہ میرے مالک کی طرف سے آرہا ہے، میرے

---

(۱) اس طرح کا واقعہ خطبات حکیم الامت ج ۲۱ ص ۲۷۲ پر حضرت بہلول رحمہ اللہ کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے واللہ اعلم از مرتب۔

مالک کی حکمت کے مطابق آرہا ہے، میرے مالک کی تقدیر کے مطابق میرا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی یہ بات تمہارے دشمن کو نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر اپنا خنجر آزمائے۔ یعنی یہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں۔ یہ بھی ان کی رحمت کا عنوان ہے، جب ان کی رحمت کا عنوان ہے تو دوسروں کو کیوں پہنچیں یہ بھی ہمیں پہنچیں۔

ایک مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کا محبوب ہے۔ اس سے آپ کو انتہا درجے کی محبت ہے، اس محبوب کے دور ہونے کی وجہ سے بہت عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اچانک وہ محبوب آپ کے پاس آتا ہے اور چپکے سے آکر آپ کو پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبالیتا ہے، اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹنے کے قریب ہونے لگتی ہیں، آپ کو تکلیف ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں آپ چیختے اور چلّاتے ہیں، اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں۔ اگر تمہیں میرا یہ دبانا پسند نہیں ہے تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے رقیب کو دبالیتا ہوں۔ اگر تم عاشقِ صادق ہو تو یہی جواب دو گے کہ میرے رقیب کو مت

دبانا، بلکہ مجھے ہی دباؤ اور زور سے دباؤ اور یہ شعر پڑھو گے کہ ؂

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں یہ ادراک عطا فرمادے کہ یہ تکلیفیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عنوان ہیں، لیکن ہم چونکہ کمزور ہیں، اس لیے ہم ان تکالیف کو مانگتے نہیں، لیکن جب وہ تکلیف آ گئی تو ان کی حکمت اور فیصلے سے آئی ہے، اس لیے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔

تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو

ہمارے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان تکالیف کو مانگیں، لیکن جن کو ان تکالیف کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے، وہ بعض اوقات مانگ بھی لیتے ہیں، چنانچہ بعض صوفیائے کرام سے مانگنا منقول ہے کہ خاص کر وہ تکلیف جو دین کے راستے میں پہنچے، اس کو تو عاشقانِ صادق نے ہزارہا تکالیف پر مقدم اور افضل قرار دیا۔ اس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ ؂

بجرمِ عشقِ تو می کشند غوغا ایست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشا ایست

یعنی تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں اور گھسیٹ رہے ہیں اور ایک شور برپا ہے، آ کر دیکھ کہ تماشے کا کیسا شان دار منظر ہے۔

یہ تو بڑے لوگوں کی بات ہے، لیکن ہم لوگ چونکہ کمزور ہیں، طاقت، قوت اور صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے ان تکالیف کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے نہیں ہیں، بلکہ عافیت مانگتے ہیں کہ یا اللہ! عافیت عطا فرمایئے اور جب تکالیف آ جاتی ہے تو اس کے ازالے کی بھی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تکالیف اگرچہ آپ کی نعمت ہے، لیکن ہماری کمزوری پر نظر کرتے ہوئے اس نعمت کو عافیت کی نعمت سے بدل دیجیے، لیکن پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا نام ''رضا بالقضاء'' ہے۔ تقدیر پر ایمان تو سب کا ہوتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہ ہوگیا، لیکن اس عقیدے کو اپنی زندگی کا حال بنانا چاہیے۔ ''حال'' بنانے کے بعد ان شاء اللہ پریشانی پاس نہیں بھٹکے گی۔

اللہ والوں کا حال

چنانچہ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کو آپ کبھی بے تاب اور بے چین اور پریشان نہیں پائیں گے۔ ان کے ساتھ کیسا ہی بڑے سے بڑا ناگوار واقعہ پیش آ جائے اس پر ان کو غم تو ہوگا، لیکن بے تابی اور بے چینی اور پریشانی ان کے پاس بھی نہیں بھٹکتی، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، اس پر راضی رہنا ضروری ہے، لہٰذا انسان کی زندگی میں جب بھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آ جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ خیال کرتے ہوئے اس پر راضی رہنے کی فکر کرے۔ غم، صدمہ اور پریشانی کا یہی علاج ہے اور ایسا کرنے سے اس کو اعلیٰ درجے کا صبر حاصل ہوجائے گا اور صبر وہ اعلیٰ عبادت ہے جو ساری عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ[1]

''یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔''

کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں

ہر تکلیف کے موقع پر یہ سوچنا چاہیے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوسکتا جس کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار اور دولت مند ہو، بڑے سے بڑا صاحبِ منصب ہو، بڑے سے بڑا نیک، ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا نبی ہو، لہٰذا تکلیف تو تمہیں ضرور پہنچے گی۔ تم چاہو تو بھی پہنچے گی اور نہ چاہو تو بھی پہنچے گی۔ اس لیے کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں راحت بھی ہے، غم بھی ہے، خوشی بھی ہے، پریشانی بھی ہے۔ خالص راحت بھی کسی کو حاصل نہیں۔ خالص غم بھی کسی کو میسر نہیں، یہ طے شدہ بات ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا انکار کرنے والوں نے خدا کے وجود کا انکار کردیا۔ ۔العیاذ باللہ۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کرسکے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ تکلیف پہنچنی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کون سی تکلیف پہنچے اور کون سی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کرلو کہ مجھے فلاں تکلیف پہنچے اور فلاں تکلیف نہ پہنچے۔ کیا تمہارے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ تم یہ فیصلہ کرو کہ فلاں تکلیف میرے حق میں بہتر ہے اور فلاں تکلیف بہتر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ تم نہیں جانتے کہ کون سی تکلیف کا

(۱) سورۃ الزمر آیت (٦)۔

انجام میرے حق میں بہتر ہوگا اور کون سی تکلیف کا انجام بہتر نہیں ہوگا، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور یہ کہہ دو کہ یا اللہ ! آپ اپنے فیصلے کے مطابق جو تکلیف دینا چاہیں وہ دے دیجیے اور پھر اس کو برداشت کرنے کی طاقت بھی دے دیجیے اور اس پر صبر بھی عطا فرمائیے۔

چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے

انسان بے چارہ اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اس نے مجھے کسی بڑی تکلیف سے بچالیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو بخار آ گیا، تو اب اس کو بخار کی تکلیف نظر آ رہی ہے یا کوئی شخص کسی ملازمت کے لیے کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ ملازمت اس کو نہیں ملی، اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے یا گھر میں سامان چوری ہوگیا۔ اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر یہ تکلیف نہ پہنچتی تو دوسری کون سی تکلیف پہنچتی ؟ اور وہ تکلیف بڑی تھی یا یہ تکلیف بڑی ہے؟ چونکہ اس کو اس کا علم نہیں ہے۔ اس لیے جو تکلیف اس کو پہنچی ہے تو اس کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، اس کا ذکر اور چرچا کرتا رہتا ہے کہ ہائے مجھے یہ تکلیف پہنچ گئی، بلکہ اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اچھا ہوا کہ اس چھوٹی سی تکلیف پر بات ٹل گئی، ورنہ خدا جانے کتنی بڑی مصیبت آتی ؟ کیا بلا نازل ہوتی ؟ یہ سوچنے سے انسان کو تسلی ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو دکھا بھی دیتے ہیں کہ جس مصیبت کو تم بڑی تکلیف سمجھ رہے تھے دیکھو وہ کیسی رحمت ثابت ہوئی۔

اللہ سے مدد مانگو

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری تسلّی کے لیے یہ دعا بھی تلقین فرمادی کہ:

"لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ"(۱)

اللہ تعالیٰ سے بچاؤ کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اسی کی آغوشِ رحمت میں پناہ لو۔ یعنی اس کے فیصلے پر راضی رہو، پھر اسی سے مدد مانگو یا اللہ! اس کو دور فرمادیجیے۔ اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں کہ ایک تیر انداز تصور کرو، جس کے پاس اتنی بڑی تیر کمان ہے جس نے ساری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے اور اس کمان کے ہر ہر حصے میں تیر لگے ہوئے ہیں اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی محفوظ نہیں ہے، جس جگہ پر وہ تیر نہ پہنچ سکتے ہوں۔ پوری دنیا کا چپہ چپہ اس کی زد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے تیر انداز کے تیروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں پر جاکر ان تیروں سے بچا جاسکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس تیر انداز کے پہلو میں جاکر کھڑے ہوجاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ بچاؤ کی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ مصائب، یہ حوادثات، یہ پریشانیاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلوں کے تیر ہیں۔ ان تیروں سے اگر بچاؤ کی کوئی جگہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دامنِ رحمت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ! ناقابلِ برداشت تکلیف مت دیجیے اور جب تکالیف دیں تو اس پر صبر بھی عطا فرمادیں، اور اس کو میری مغفرت اور ترقیٔ درجات کا ذریعہ بنادیجیے۔ آمین۔

---

(۱) صحیح البخاری ۵۸/۱ (۲۴۷) و ۶۸/۸ (۶۳۱۱) وصحیح مسلم ۲۰۸۱/۴ (۲۷۱۰)۔

ایک نادان بچے سے سبق لیں

آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا ہوگا کہ جب ماں اس کو مارتی ہے، اس وقت بھی وہ ماں ہی کی گود میں اور زیادہ گھستا ہے، حالانکہ جانتا ہے کہ میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بچہ یہ بھی جانتا ہے کہ ماں پٹائی تو کر رہی ہے، لیکن اس پٹائی کا علاج بھی اسی کے پاس ہے، مجھے شفقت اور محبت بھی اسی کی آغوش میں مل سکتی ہے، لہٰذا جب کبھی کوئی ناگوار بات یا واقعہ پیش آجائے تو یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی آغوشِ رحمت میں مجھے پناہ مل سکتی ہے، یہ سوچ کر پھر اسی سے اس کے ازالے اور اس پر صبر کی دعا کریں۔ یہ ہے ''رضا بالقضاء''۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادیں۔ آمین۔

اللہ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا أَرْضَاهُ بِمَا قَسَمَ لَهُ، وَبَارَكَ لَهُ فِيهِ، وَإِذَا لَمْ يُرِدْ بِهِ خَيْرًا، لَمْ يُرْضِهِ بِمَا قَسَمَ لَهُ، وَلَمْ يُبَارِكْ لَهُ فِيهِ''(۱)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنی قسمت پر راضی کر دیتے ہیں اور اس قسمت میں اس کے لیے برکت بھی عطا

---

(۱) الزهد والرقائق لابن المبارک ۳۲/۲ والرضا عن الله بقضاءه لابن ابی الدنیا ص ۸۳ (۵۵) والقناعة لابن ابی الدنیا ص ۶۰ (۱۳۲) طبع موسسة الکتب الثقافیه۔

فرماتے ہیں اور جب کسی سے بھلائی کا ارادہ نہ فرمائیں -العیاذ باللہ -تو اس کو اس کی قسمت پر راضی نہیں کرتے، یعنی اس کے دل میں قسمت پر اطمینان اور رضا پیدا نہیں ہوتی، اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہے اس میں بھی برکت نہیں ہوتی، اس حدیث کے ذریعے یہ بتادیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو قسمت پر راضی کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کو تھوڑا ملا ہو، لیکن اس تھوڑے میں ہی اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمادیتے ہیں۔

برکت کا مطلب اور مفہوم

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے، ہر چیز کی گنتی گنی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپے ملتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے ملتے ہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں دیکھتا کہ اس گنتی کے نتیجے میں مجھے کتنی راحت ملی؟ کتنا آرام ملا؟ کتنی عافیت حاصل ہوئی؟ اب مثلاً ایک شخص کو پچاس ہزار روپے مل گئے، لیکن گھر کے اندر پریشانیاں، بیماریاں ہیں، سکون حاصل نہیں ہے اور ہر وقت پریشانی کے اندر مبتلا ہے۔ اب بتائیے وہ پچاس ہزار کس کام کے؟ اس سے پتہ چلا کہ وہ پچاس ہزار روپے برکت والے نہیں تھے، بے برکتی والے ہیں۔ ایک دوسرا شخص ہے جس کو ایک ہزار روپے ملے، لیکن اس کو راحت اور آرام و عافیت میسر ہے۔ تو اگرچہ وہ گنتی میں ایک ہزار ہیں، لیکن اپنے حاصل اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ہزار والا پچاس ہزار والے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار برکت والے تھے اور اس ایک ہزار سے بے شمار کام اور فائدے حاصل ہو گئے۔

ایک نواب کا واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب تھے۔ ان کی بڑی زمینیں، جائیدادیں، نوکر چاکر وغیرہ سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان نواب صاحب نے خود مجھے بتایا کہ ''میں اپنے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس یہ ساری دولتیں ہیں، جو آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن مجھے ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا، میرے معالج نے میرے لیے صرف ایک غذا تجویز کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ گوشت کا قیمہ بناؤ اور اس قیمہ کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کا رس نکالو اور اس کو چمچے کے ذریعے پیو۔'' اب دیکھیے! دسترخوان پر دنیا بھر کے انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں، ہزار قسم کی نعمتیں حاصل ہیں، لیکن صاحب بہادر نہیں کھا سکتے، اس لیے کہ بیمار ہیں، ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے۔ بتاؤ وہ دولت کس کام کی جس کو انسان اپنی مرضی سے استعمال نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں برکت نہیں ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نعمت بے کار ہوگئی۔ ایک دوسرا آدمی جو محنت مزدوری کرتا ہے، ساگ روٹی کھاتا ہے، لیکن بھرپور بھوک کے ساتھ اور پوری لذت کے ساتھ کھاتا ہے اور وہ کھانا اس کے جسم کو جا کر لگتا ہے۔ اب بتائیے! یہ مزدور بہتر ہے یا وہ نواب بہتر ہے؟ حالانکہ گنتی اس کی زیادہ ہے اور اس مزدور کی گنتی کم ہے، لیکن راحت اس مزدور کو نصیب ہے۔ اس نواب کو میسر نہیں۔ اس کا نام ہے برکت۔

قسمت پر راضی رہو

بہر حال! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جو بندہ قسمت پر راضی ہو جائے اور قسمت پر راضی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تدبیر چھوڑ دے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ کام کرتا رہے، لیکن ساتھ میں اس پر راضی ہو کہ اس کام کے کرنے کے نتیجے میں جو کچھ مل رہا ہے وہ میرے لیے بہتر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسی میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اسی کو راحت کا سبب بنا دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص قسمت پر راضی نہ ہو، بلکہ ہر وقت ناشکری کرتا رہے اور یہ کہتا رہے کہ مجھے تو ملا ہی کیا ہے؟ میں تو محروم رہ گیا، میں تو پیچھے رہ گیا۔ تو اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ملا ہوا ہے، اس کی لذت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اس میں برکت نہیں ہوتی۔ انجام تو وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے اور اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے، تمہارے رونے سے ناشکری کرنے سے تمہاری حالت نہیں بدل جائے گی، لیکن اس ناشکری سے نقصان یہ ہوگا کہ موجودہ نعمت سے جو نفع حاصل ہو سکتا تھا وہ بھی حاصل نہ ہوا۔

میرے پیمانے میں، لیکن حاصلِ میخانہ ہے

اس لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر راضی رہو، چاہے وہ مال و دولت کی نعمت ہو، پیشے کی نعمت ہو، صحت کی نعمت ہو۔ حسن و جمال کی نعمت ہو، دنیا کی ہر دولت اور ہر نعمت پر راضی رہو اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس مقدار میں مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں، لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی دوسروں کے پیالوں میں کتنی مے بھری ہے، مجھے اس سے کیا تعلق؟ لیکن میرے پیمانے میں جو مے ہے وہ میرے لیے کافی ہے، لہٰذا مجھے اس سے کیا غرض کہ کسی کو ہزار مل گئے۔ کسی کو لاکھ ملے، کوئی کروڑ پتی بن گیا، لیکن جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ میں اسی میں مگن ہوں اور اس پر خوش ہوں۔ بس یہ فکر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر سے قناعت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رضا بالقضاء حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تکلیفیں اور صدمے دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ فکر عطا فرما دے اور اس کو ہمارا حال بنادے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
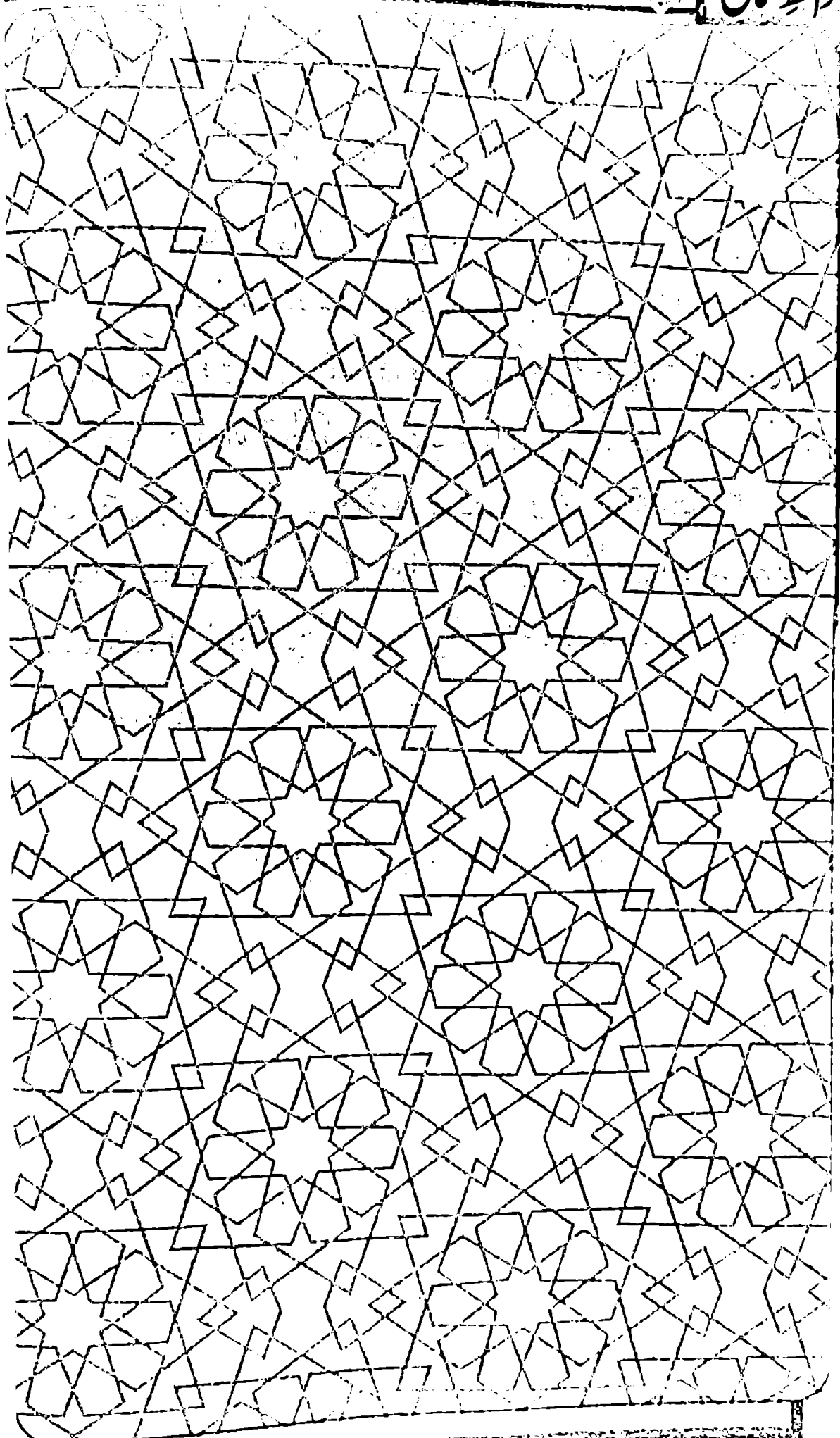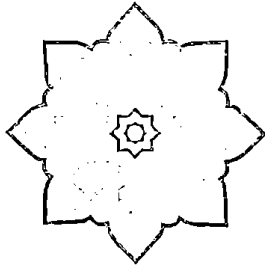
اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

(اصلاحی خطبات ج ۱۶ ص ۱۲۳)
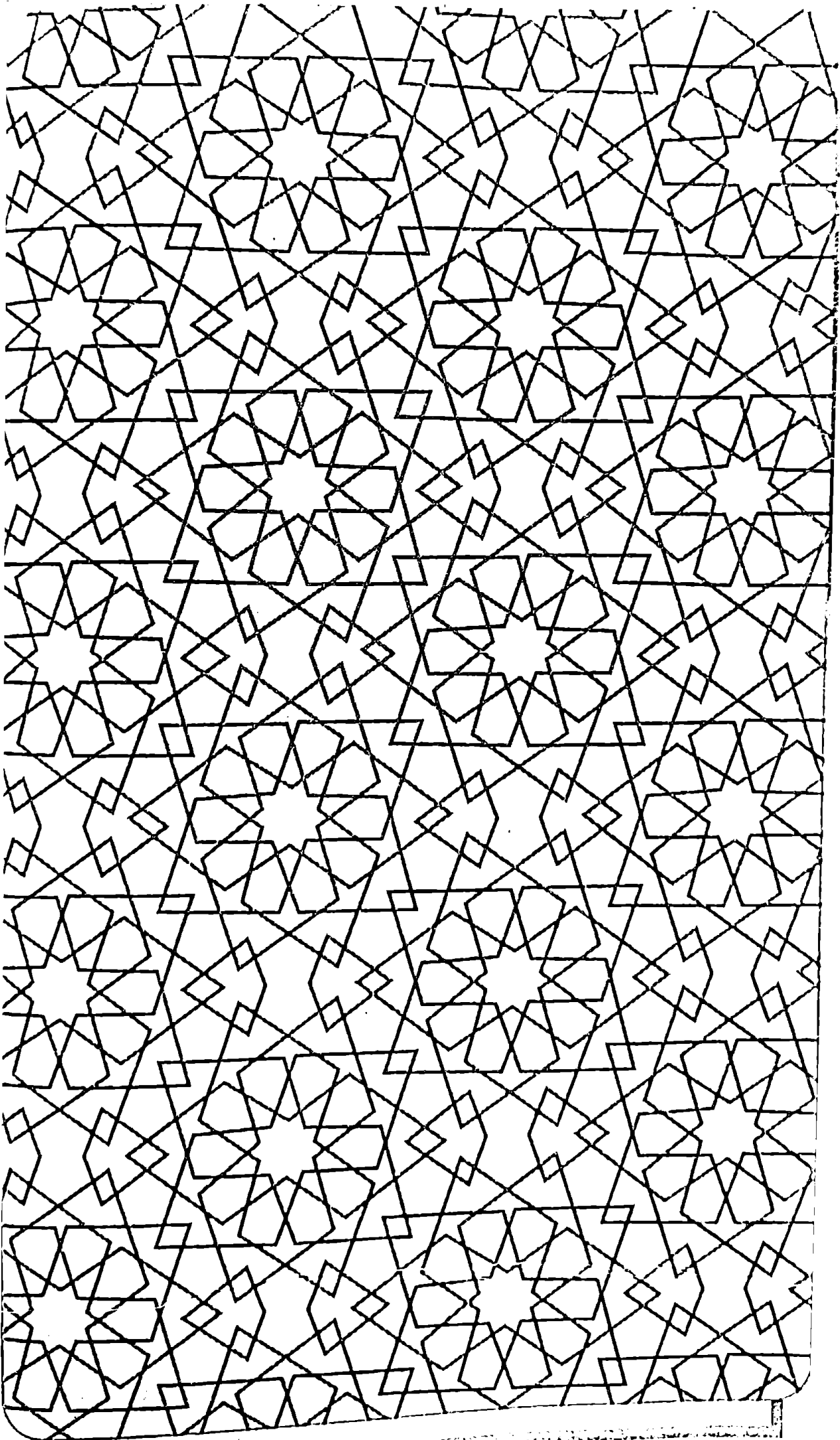
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ
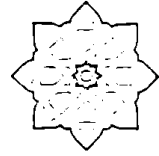
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

فقد قال رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَسَلَّمَ:

”وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ“(۱)

(۱) سنن الترمذی ۱۴۰/۴ (۲۳۰۵) وقال هذا حديث غريب۔ ومسند احمد ۴۵۸/۱۳ (۸۰۹۵)۔

تمہید

یہ ایک حدیث ہے جس کا بیان گزشتہ دو تین روز سے چل رہا ہے، جس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ جملے ارشاد فرمائے، ہر جملہ ایک مستقل نصیحت پر مشتمل ہے، پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

"اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ"

گناہوں سے بچو تو تم ساری دنیا میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

"وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ"

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس دوسرے جملے میں دو نصیحتیں ہیں، ایک یہ کہ انسان قناعت اختیار کرے، یعنی جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ اسے مل رہا ہے اس پر صبر اور شکر کرے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی تقدیر پر اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہے، جس کو "رضا بالقضاء" کہتے ہیں، قناعت کے بارے میں گزشتہ کل کچھ گزارشات عرض کر دی تھیں۔

اس کائنات میں تین عالم ہیں

اس جملے کا دوسرا پہلو ''رضا بالقضاء'' ہے، یہ صرف مال و دولت ہی کے معاملے میں نہیں، بلکہ زندگی میں انسان کے ساتھ جتنے واقعات پیش آتے ہیں، ان سب میں اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا ''رضا بالقضاء'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں خوشی ہی خوشی ہے، راحت ہی راحت ہے، رنج کا وہاں نام نہیں، تکلیف کا وہاں گزر نہیں، وہ عالمِ جنت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔ دوسرا عالم وہ ہے جہاں تکلیف ہی تکلیف ہے، رنج ہی رنج ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، وہ ہے عالمِ جہنم، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس سے پناہ میں رکھے، آمین۔ ان دونوں کے درمیان یہ ''عالمِ دنیا'' ہے، جس میں خوشی بھی ہے، رنج بھی ہے، راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، اس کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو خوشی ہی خوشی ملی ہو، صدمہ نہ ملا ہو یا جس کو صدمہ ہی صدمہ ملا ہو خوشی نہ ملی ہو، بلکہ دنیا میں دونوں چیزیں ملی جلی چلتی ہیں۔

رنج اور تکلیف ضرور پہنچے گی

لہٰذا اس دنیا میں ایسے واقعات لازماً پیش آنے ہیں جو انسان کی طبیعت کے خلاف ہوں گے، جن سے انسان کو صدمہ اور رنج پہنچے گا، تکلیف پہنچے گی، لیکن اس تکلیف کے نتیجے میں چاہے آدمی روئے، چاہے اظہارِ رنج کرے، لیکن اس کا دل اس بات پر راضی ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے لیے جو فیصلہ کیا ہے، وہ فیصلہ برحق ہے، اگرچہ بظاہر اس سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، اسی کا نام

''رضا بالقضاء'' ہے۔ مثلاً کوئی بیماری آ گئی، اب اس بیماری کی وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے، صدمہ بھی ہے، آہ بھی منہ سے نکل رہی ہے، رونا بھی آ رہا ہے، لیکن دل اس بات پر مطمئن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو بیماری بھیجی ہے، ان کا فیصلہ برحق ہے، مجھے اس پر کوئی شکوہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے مجھے کوئی شکایت نہیں، اس کا نام ''رضا بالقضاء'' ہے، جو مطلوب ہے۔

دل میں شکایت نہ ہو

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آنکھ سے آنسو جاری ہیں، دل میں صدمہ ہو رہا ہے، لیکن ہم چونکہ اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہیں، لہٰذا ہم وہی کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا (۱)، لہٰذا ''رضا بالقضاء'' میں دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ صدمہ بھی ہے، آنسو بھی بہہ رہے ہیں، تکلیف بھی ہو رہی ہے، لیکن دل اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر مطمئن ہے کہ اس نے تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ برحق تھا اور حکمت کے عین مطابق تھا، یہ ہے ''رضا بالقضاء'' اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمادے، آمین۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ یہ کہنا شروع کر دے کہ یہ مصیبت مجھ پر ہی کیوں آئی؟ ایسا میں نے کون سا گناہ کر لیا جس کی پاداش میں پکڑا گیا - العیاذ باللہ - اس قسم کے کلمات زبان سے نکل جاتے ہیں، یہ درحقیقت بے صبری ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوہ ہے، جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہیے اور کبھی ایسا جملہ زبان پر نہیں لانا چاہیے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۸۳/۲ (۱۳۰۳) وصحیح مسلم ۱۸۰۷/۴ (۲۳۱۵)۔

رونے کی اجازت دے دی

یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ باوجودیکہ ان کا ہر فیصلہ حکمت کے عین مطابق ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں مصیبت اور تکلیف پر رونے کی اجازت دے رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی حکمت کے مطابق کیا ہے، اسی میں تمہارے لیے خیر ہے اور اس پر تمہیں رونے کی اجازت نہیں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے ضعف اور ہماری کمزوری سے باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ اس بندے کو ہماری حکمتوں کا پتہ نہیں، لہٰذا اگر یہ رو رہا ہے تو رونے دو، بلکہ فرمایا[1] ہم رونے پر اور دل کے صدمے پر تمہیں اجر بھی دیں گے بس ایک بات کا مطالبہ ہے، وہ یہ کہ ہمارے فیصلے پر اعتراض نہ کرنا، شکایت نہ کرنا۔

جو اللہ کی مرضی وہی میری مرضی

اسی واسطے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ اس شخص کا کیا مزاج پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، یعنی اپنے بارے میں فرمایا کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ میرے مزاج کے مطابق ہو رہا ہے، اس لیے مجھ سے زیادہ خوشی میں عیش وآرام میں کون ہوگا؟

---

(۱) جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ "ما من مصيبة تصيب المسلم إلا كفر الله بها عنه حتى الشوكة يشاكها. ملاحظہ ہو صحیح بخاری ۱۱٤/۷ (٥٦٤٠) وصحیح مسلم ۱۹۹۲/٤(۲٥۷۲).

سوال کرنے والے نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آج تک کسی شخص کے بارے میں نہ یہ سنا اور نہ یہ دیکھا کہ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ جو انبیاء کرام علیہم السلام نے چاہا وہ ہوگیا ہو، آپ کے ساتھ یہ کیسے ہوگیا؟ جواب میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، یعنی جو میرے مولیٰ کی مشیت، وہ ہی میری بھی مرضی، میرے مولیٰ نے جو فیصلہ کر دیا، میں بھی اس پر راضی ہوں، بس اب کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، اس لیے کہ میری مرضی وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا حکم

بھائی! اگر انسان اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوجائے تو اس سے زیادہ راحت کا کوئی اور کام نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی کیوں ہوجائے؟ جب کہ بظاہر وہ فیصلہ دیکھنے میں برا اور تکلیف دہ معلوم ہو رہا ہے، اس کی وجہ اللہ جل شانہ نے ''سورۃ الکہف'' میں بیان فرمادی، جہاں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ اس ملاقات کا سبب یہ ہوا کہ کسی شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے؟ ظاہر ہے کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے اور پوری روئے زمین پر آپ کا مقام سب سے اعلیٰ تھا، اس لیے انہوں نے کہہ دیا کہ ''سب سے بڑا عالم میں ہوں''۔ اس لیے کہ پیغمبر سے بڑا عالم تو کوئی ہوتا نہیں، لیکن اللہ جل شانہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب پسند نہیں آیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا اور ساتھ میں ان کو تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ علم

کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا چاہیے تھا اور یوں کہنا چاہیے تھا کہ ہمیں کیا معلوم کہ کون بڑا عالم ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ہم تمہیں ایک ایسے بندے کے پاس بھیجتے ہیں جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاموش نہ رہنا

اور یہ حکم دیا کہ کچھ دن ان کے پاس رہو اور ان کی صحبت حاصل کرو، اب حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پابندی لگا دی کہ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو خاموش رہنا ہوگا، مجھ سے کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے وعدہ کر لیا کہ اچھی بات ہے، مگر جب ان کے ساتھ سفر پر چلے تو دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام جو کام کر رہے ہیں وہ الٹا کر رہے ہیں، چنانچہ دریا پار کرنے کے لیے کشتی میں بیٹھے تو اس کشتی کے تختے نکال دیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے، آپ سے خاموش نہیں رہا گیا آپ نے فرمایا:

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا (۱)

یعنی تم نے ایک عجیب چیز کر لی۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خاموش رہنا اور کچھ مت بولنا، جب تک میں نہ بتاؤں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا معاف کر دو:

---

(۱) سورۃ الکہف آیت (۷۱)۔

لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا(۱)

میرے بھولنے پر مواخذہ نہ کریں، میرا کام مجھ پر مشکل مت کیجیے۔

جب آگے چلے تو دیکھا کہ ایک بچہ کھیل رہا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس بچے کو قتل کر دیا، اب وہ بچہ نابالغ، معصوم، وہ بچہ جو کسی گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوا، ایسے بچے کو قتل کر دینا بڑا سنگین گناہ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام تو پیغمبر تھے، ایسے فعل کو کیسے برداشت کر سکتے تھے، فوراً انہوں نے اور زیادہ شدت سے اس عمل پر نکیر کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا (۲)

یہ تو تم نے بہت برا کام کیا کہ ایک بچے کو مار ڈالا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ساتھ چپ چاپ چلنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس قسم کے منظر دیکھنا میرے بس کی بات نہیں، اب اگر بولوں تو آپ کا راستہ الگ، میرا راستہ الگ، میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

ان کی دنیا اور ہے

اس طرح اللہ جل شانہ نے مختلف واقعات دکھائے، اب دیکھیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ کر چکے تھے کہ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا، اگر آپ یہ

---

(۱) سورۃ الکہف آیت (۷۳)۔
(۲) سورۃ الکہف آیت (۷۴)۔

کہتے ہیں کہ میں سوال نہ کروں تو میں سوال نہیں کروں گا، لیکن جب وقت آیا تو ہر جگہ پوچھا، ہر جگہ اعتراض کیا، کیوں؟ اس لیے کہ وعدہ اپنی جگہ تھا، لیکن شریعت کا حکم اپنی جگہ تھا، شریعت کا حکم یہی ہے کہ اگر تم کسی بچے کو قتل ہوتا دیکھ رہے ہو تو اس کو روکو، اس وقت خاموش رہنا شریعت کا تقاضا نہیں۔ بعد میں حضرت خضر علیہ السلام نے ان تمام امور کی وجہ بیان کی کہ میں نے کون سا کام کیوں کیا تھا؟ کشتی کا تختہ کیوں نکالا تھا؟ بچے کو قتل کیوں کیا تھا؟ اور وہ دیوار کیوں سیدھی کی تھی؟ اس کی تفصیل بتائی کہ اس عمل کے پیچھے کیا مقاصد تھے؟ چنانچہ وہ مقاصد بتادیے، سمجھ میں بھی آ گئے، پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ آگے نہیں چلے، اس لیے کہ ان کی دنیا اور ہے، ہماری دنیا اور ہے، ہمارا تمہارا میل نہیں ہوسکتا۔

ہر واقعے میں حکمتیں پوشیدہ ہیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جو بھیجا تھا اس کے ذریعے درحقیقت یہ دکھانا تھا اور اس حقیقت کی وضاحت ذہن نشین کرانی تھی کہ کائنات میں جو واقعات پیش آرہے ہیں، تم ان واقعات کے صرف ظاہر پر مت جاؤ، بلکہ ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی نہ جانے کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، جو تمہاری عقل کی ادراک سے ماوراء ہیں۔ ایک دنیا وہ ہے جس کو ''تشریعی دنیا'' کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کی شریعت کی دنیا، جس میں ہم ظاہری احکام کے مکلّف ہیں، مثلاً یہ کہ کسی انسان کو نقصان مت پہنچاؤ، کسی کو تکلیف مت دو، کسی کو قتل مت کرو، کسی کی آبروریزی نہ کرو، وغیرہ اور ہم ان ظاہری احکام کے مکلّف ہیں۔

بچے کو قتل کرنے کی حکمت

لیکن کائنات میں جو واقعات ہمیں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، ہم ان واقعات کو اپنے محدود مفاد کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، جب کہ ان واقعات کا فیصلہ اس ذات کی طرف سے ہو رہا ہوتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات کی وسعتیں ہیں، وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اب حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے میں دیکھیے کہ انہوں نے اس بچے کو قتل کر دیا، اگر حضرت خضر علیہ السلام اس بچے کو قتل نہ کرتے بلکہ اچانک وہ بچہ مر جاتا یا کوئی دوسرا آدمی اس کو قتل کر دیتا تو آپ اس وقت یہی سوچتے کہ یہ بہت برا کام ہوا، اس لیے کہ یہ نابالغ اور معصوم بچہ تھا اور کسی نے اس کو قتل کر دیا، آپ اس بچے کو مظلوم سمجھتے اور اس پر ترس کھاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ یہ واقعہ ظاہری نظر میں تو بہت برا تھا، لیکن اس واقعہ کے پیچھے کائنات کے مجموعی نظام کے تحت جو حکمت تھی وہ کچھ اور تھی، اس لیے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر سرکش ہونے والا تھا اور یہ بچہ اپنے ماں باپ کو بھی دین سے گمراہ کر دینے والا تھا، لہٰذا ہم نے اس بچے کو ختم کر دیا اور اس کے بدلے دوسرا بچہ دے دیا، حضرت خضر علیہ السلام نے یہ حکمت بتا دی۔

اپنی عقل کو چھوڑ دو

لیکن اگر انسان اپنی عقل سے سارے فیصلے کرنے لگے تو وہ یہاں پر اعتراض کر سکتا ہے کہ اس بچے کو پیدا کر کے مار دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ اس بچے کو پیدا ہی نہ کرتے اور اس کے ماں باپ کو پہلے ہی اچھا بچہ دے دیتے، ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس کا کیا جواب ہے؟ یاد رکھیے انسان کے پاس

آخر کار اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انسان اپنی عقل کے ہتھیار ڈال دے اور یہ کہہ دے کہ یہ سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہو رہے ہیں، ہماری محدود عقل اس کی حکمتوں اور اس کے فوائد کا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔ بہرحال! بظاہر بچے کے قتل کا واقعہ برا نظر آ رہا ہے، لیکن پوری کائنات کے مجموعی انتظام کے لحاظ سے وہ عظیم واقعہ ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر میں

ان کی حکمت اور مصلحت کو دیکھیے کہ فرعون کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کر رہے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے "سامری" کی پرورش کرا رہے ہیں:

وَمُوْسی الَّذِیْ رَبَّاہُ جِبْرِیْلُ کَافِرٌ
وَمُوْسی الَّذِیْ رَبَّاہُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلُ(۱)

سامری کا نام بھی "موسیٰ" تھا، اس کی پرورش حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کی تھی، جب فرعون نے بچوں کے قتل کا حکم جاری کیا تو اس وقت سامری کی پیدائش ہوئی تو سامری کی ماں نے اس کو پہاڑ کے ایک غار میں رکھ دیا، اس غار میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کو بھیج دیا کہ اس غار میں ایک بچہ پڑا ہوا ہے اس بچے کو کھلاؤ پلاؤ اور اس کی پرورش کرو، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام روزانہ اس بچے کو کھلاتے پلاتے تھے، لیکن وہ بچہ بڑا ہونے کے بعد "سامری"

(۱) روح المعانی ۲/۲۱۳ طبع دار الکتب العلمیۃ و ۸/۳۵۰ و ۵۵٤۔

جادوگر کافر بن گیا[1]۔ اس شعر میں یہی کہا جا رہا ہے کہ جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا وہ کافر ہو گیا اور جس موسیٰ کو فرعون نے پالا وہ پیغمبر ہوئے، یہ تو ان کی حکمت اور قدرت کے کرشمے ہیں، جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

عبرت ناک واقعہ

ایک قصہ[2] کتابوں میں لکھا ہے۔ یہ قصہ کتنا مستند اور درست ہے؟ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن یہ قصہ بڑا عبرتناک ہے، وہ یہ کہ اللہ جل شانہ نے ملک الموت سے پوچھا کہ میں نے تمہیں انسانوں کی روحیں قبض کرنے پر مقرر کر رکھا ہے اور تم بے شمار انسانوں کی روحیں روزانہ قبض کرتے ہو، کیا کبھی کسی شخص کی روح قبض کرتے ہوئے ترس بھی آیا؟ جواب میں ملک الموت نے کہا کہ ہاں! ترس آیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کس پر ترس آیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ دو آدمیوں پر مجھے ترس آیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کون سے دو آدمیوں پر تمہیں ترس آیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ سمندر میں جہاز جا رہا تھا، طوفان آیا اور طوفان میں وہ جہاز تباہ ہو گیا، لوگ ڈوب گئے، کچھ لوگ جنہیں تختوں کا سہارا مل گیا، وہ بچ گئے، ایک عورت جو حاملہ تھی، وہ بھی کسی طرح ایک تختے پر سوار ہو گئی اور اسی تختے پر وہ کنارے کی طرف جا رہی تھی کہ اس کا بچہ پیدا ہو گیا، جب بچہ پیدا ہو گیا تو آپ کی طرف سے حکم آیا کہ ماں کی روح قبض کر لو،

---

(۱) تفسیر الطبری ۱۴۸/۱۶ طبع دار ہجر وتفسیر الثعالبی ۲۳۸/۱ طبع دار احیاء التراث العربی، والہدایہ الی بلوغ النہایہ ۴۶۸۹/۷ طبع الشارقۃ۔

(۲) البتہ اس جیسا واقعہ بغیر سند مختلف الفاظ کے ساتھ احیاء علوم الدین للغزالی ۴۶۸/۴ طبع دار المعرفۃ ومرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۱۵۷/۹ طبع دار الفکر میں بھی آیا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ بچہ ابھی دنیا میں آیا ہے، نہ اس بچے کا کوئی گھر ہے، نہ اس کا باپ ہے، نہ کوئی اور رشتہ دار دیکھنے والا ہے، لے دے کر ایک ماں تھی اس کی روح قبض کرنے کا حکم دے دیا، مجھے اس بچے پر ترس آیا کہ یہ بچہ سمندر کے بیچ میں تختے پر کس طرح زندگی گزارے گا۔

شدّاد پر ملک الموت کا ترس کھانا

اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اور کس پر ترس آیا؟ جواب میں ملکُ الموت نے کہا کہ ایک بادشاہ تھا، جس نے دنیا میں ایک جنت بنوائی اور اپنا زندگی بھر کا سرمایہ اس جنت کو بنانے پر خرچ کردیا، وہ بڑی عالیشان جنت بنارہا تھا اور اس نے یہ تہیہ کیا تھا کہ جب تک وہ جنت مکمل طور پر تیار نہیں ہوجائے گی، اس وقت تک اس کے اندر داخل نہیں ہوں گا، جب مدتوں کے بعد تیار ہوگئی تو اس وقت اس نے اس جنت کے اندر جانے کا ارادہ کیا، جب وہ اندر داخل ہونے لگا ابھی اس کا ایک پاؤں جنت کے اندر تھا اور ایک پاؤں جنت کے باہر تھا، اس وقت آپ کا حکم آ گیا کہ اس کی روح قبض کرلو، اس وقت مجھے اس پر ترس آیا کہ یہ شخص کیسا ہی برا صحیح، لیکن اس نے اتنی محنت و مشقت سے وہ جنت بنوائی تھی، کم از کم اندر جا کر اُس جنت کو دیکھ ہی لیتا اور کم از کم اس کی محنت کا کچھ صلہ اس کو دنیا کے اندر مل جاتا۔

ایک آدمی پر دو مرتبہ ترس کھانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ملک الموت! تم نے ایک ہی آدمی پر دو مرتبہ ترس کھایا، اس لیے کہ یہ بادشاہ وہی بچہ تھا جس کو تختے پر تیرتا ہوا تم نے دیکھا تھا

اور اس کی ماں کی روح قبض کرتے وقت تم نے اس بچے پر ترس کھایا تھا، وہی بچہ اب بادشاہ بن گیا تھا اور اب اس بادشاہ کی روح قبض کرتے ہوئے تم نے دوبارہ اس پر ترس کھایا۔ بہرحال! ان کی حکمت کے بھید کون جان سکتا ہے؟ کس کے ساتھ کیا معاملہ ہورہا ہے؟ اور کس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے؟ یہ بات انسان کی عقل سے ماوراء ہے کہ اس کائنات کا نظام کس طرح چل رہا ہے؟ ایک عقل مند انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوجائے اور ہتھیار ڈال دے کہ ہاں! جو آپ کا فیصلہ ہے وہی درست ہے، میں یہ نہیں جان سکتا کہ اس فیصلے کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ یہ ان ہی کے فیصلے ہیں کہ بڑے بڑے سرکش اور بڑے بڑے نافرمان ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں، وہ لوگ اس دنیا میں بڑھ رہے ہیں، ترقی کررہے ہیں، ان کا ڈنکا بج رہا ہے، ان کے پاس دولت آرہی ہے، ان کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود ہیں اور جو اپنے پیارے ہیں جو اپنے محبوب ہیں ان کو آروں سے چِروایا جارہا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو آروں سے چِروادیا[1]، یہ ان ہی کے فیصلے ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چون و چرا نہ رسد در قضائے ما

ہم بعض اوقات اپنے دشمن کو پالتے ہیں اور اپنے پیاروں کو مروا دیتے ہیں، ہمارے فیصلے میں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں۔

---

(۱) الخطب والمواعظ لأبی عبید ۱۶۹ (۹۶) طبع مکتبة الثقافية، والمجالسة وجواهر العلم ۳۳۲/۱ (٤٠) طبع دار ابن حزم، وزهر الفردوس ٤١١/٤ (١٥٠٢)، طبع جمعية دار البر.

انبیاء علیہم السلام پر بلائیں سب سے زیادہ

ارے! انبیاء علیہم السلام سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے لاڈلے کون ہوں گے؟ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ

"اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ"(۱)

سب سے زیادہ بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں، پھر جو ان سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے ان کے اوپر آتی ہیں۔ اس لیے کائنات میں واقع ہونے والے واقعات کے بارے میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ انسان ان واقعات میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائے کہ ان کا جو بھی فیصلہ ہے، اس کی حکمتیں وہی جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے، بس ہمارا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے سر جھکا دیں، اس میں کسی رائے زنی کی گنجائش نہیں، اس کا جو فیصلہ ہے وہ برحق ہے۔

زلزلہ آنے میں حکمت اور مصلحت

اب ہمارے ملک میں چند روز پہلے زلزلہ آیا، یہ کتنی بڑی آفت اور مصیبت تھی، کتنے شہروں میں ہمارے مسلمان بہن بھائی پریشانی کا شکار ہو گئے، اب بظاہر دیکھنے میں اس واقعے میں کوئی خیر کا پہلو نظر نہیں آتا، بظاہر یہ واقعہ برا ہی برا ہے، ہزاروں انسان اس میں شہید ہوئے، ہزاروں انسان زخمی ہوئے، ہزاروں انسان بے گھر ہوئے، لیکن اگر ایک شخص صاحبِ ایمان ہے تو اس کے

---

(۱) السنن الکبری للنسائی ۴۷/۷ (۷۴۴۰) ومسند البزار ۳۴۹/۳ (۱۱۵۰)۔ وسنن الترمذی ۲۰۳/۴ (۳۹۸) وقال هذا حديث صحيح.

لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس واقعہ کے پیچھے کیا مصلحتیں کام کررہی ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کیا بھلائیاں پیدا کرے گا اور کائنات کے مجموعی نظام کے اعتبار سے اس کے اندر کیا خیر کا پہلو ہے؟ میں نہیں جانتا، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کائنات کا کوئی ذرہ کوئی پتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہلتا اور کوئی حرکت اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بغیر نہیں ہوتی، لہٰذا سرِ تسلیم خم ہے، جو کچھ ہوا وہ ان کی حکمت کے عین مطابق ہوا، چاہے ہماری سمجھ میں وہ حکمت آئے یا نہ آئے، ہم اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے۔

یہ زلزلہ عذاب تھا یا نہیں

اب آج کل اخبارات میں، رسائل میں اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ یہ زلزلہ عذاب ہے یا نہیں؟ ایک قوم کا کہنا یہ ہے کہ یہ عذاب ہے اور ایک قوم اس کے عذاب ہونے کی نفی کررہی ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ پورے جزم، وثوق اور یقین کے ساتھ اس زلزلہ کے بارے میں کوئی بات کہنا انسان کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے کہ وہ یقین کہاں سے لائے گا؟ کیا تمہارے پاس وحی آئی تھی؟ لہٰذا کائنات کے ان واقعات کے بارے میں کس بنیاد پر یقین کے ساتھ فیصلہ کرسکتے ہو؟ ارے یہ سارے واقعات تو اس ذات کی طرف سے کنٹرول ہورہے ہیں جس کے ہاتھوں میں پوری کائنات کی باگ دوڑ ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے کیا اسباب ہیں؟ کیا فائدہ اور حکمتیں ہیں؟ یہ سب ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

تفویضِ کامل اختیار کرو

سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کا جو واقعہ بیان فرمایا وہ یہی بات سمجھانے کے لیے بیان فرمایا کہ جب اس کائنات میں غیر اختیاری واقعات رونما ہوں تو اس میں اپنی عقل دوڑانے کے بجائے اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو اور تفویضِ کامل اختیا کرو۔ یہاں بھی ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ جزم اور یقین کے ساتھ کوئی رائے زنی نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ ہمیں اس کے بارے میں معلوم نہیں۔ دیکھیے! ایک ہوتا ہے "عذاب" جو کافروں پر آتا ہے، اس کا قاعدہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی ڈرانے والا ہم ان کے پاس نہیں بھیجتے اس وقت تک ہم کسی پر اس طرح کا عذابِ عام جاری نہیں کرتے اور جو صاحبِ ایمان ہیں ان کو بھی ان کی بد اعمالیوں کی سزا بعض اوقات اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دیتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم نے فرمایا:

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۱)

لیکن وہ عذابِ عام کی شکل میں نہیں ہوتا کہ پوری کی پوری قوم ہلاک ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو عذابِ عام سے محفوظ رکھا ہے، ہاں البتہ انفرادی طور پر ایک آدمی یا ایک قبیلہ، ایک خاندان یا ایک شہر کے لوگ اپنی کسی بدعملی کی وجہ سے کسی عذاب میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الشوری آیت (۳۰)۔

زلزلے میں بے شمار فوائد

اب یہ اتنا بڑا زلزلہ آیا، جس میں لاکھوں انسان متاثر ہوئے، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا متاثر ہونا سزا تھا، کس کا متاثر ہونا بلندیٔ درجات کا سبب تھا، اس لیے کہ بعض اوقات اپنے نیک بندوں کو بھی اس قسم کے مصائب میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے ان کے درجات کی بلندی مقصود ہوتی ہے، ان کو وسعت کے مقام سے سرفراز کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں رہتے تو نہ جانے کیا انجام ہوتا۔ کسی کے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ان مصائب کو بنا دیتے ہیں، کسی شخص کے لیے ان واقعات کو تنبیہ اور تازیانہ بنا دیتے ہیں، کسی کے دل کا حال پلٹنے کے لیے اس کو ذریعہ بنا دیتے ہیں کہ اب تک ایسا منظر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا، اب تک ایسی آوازیں اپنے کانوں سے نہیں سنی تھیں، اس کے نتیجے میں دل غفلت میں مبتلا تھا، اب وہ آوازیں سن لیں اور وہ منظر دیکھ لیا، اب دل میں ڈر پیدا ہوگیا اور تنبیہ ہوگئی، خدا کو معلوم ہے کہ اس واقعے میں کس کس کے لیے کیا کیا مقاصد تھے، کیا کیا فوائد تھے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کیے۔

تخریب کے بعد تعمیر ہوتی ہے

دیکھیے! ایک تخریب ہے، ایک تعمیر ہے، ہر تخریب کے بعد ایک تعمیر ہوتی ہے، بحیثیت مجموعی پورے نظامِ کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے تو بسا اوقات تخریب ایک تعمیر کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ ایک عمارت منہدم ہوتی ہے، اس کی جگہ دوسری بہتر عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک قوم جاتی ہے، اس کی جگہ دوسری اس سے بہتر قوم آتی ہے، یہ سب فیصلے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کائنات کے اندر کرتے

رہتے ہیں، لہٰذا ہم جزم اور وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عذاب تھا یا یہ عذاب نہیں تھا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، ہاں اس بحث میں پڑنے کے بجائے ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم سے متاثرین کی جتنی مدد ہو سکتی ہے، ہم وہ مدد کریں، جان سے، مال سے اور محنت سے جو خدمت ان کی بن پڑے وہ خدمت کریں، جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں، ان کے لیے دعائے مغفرت کریں، جو موجود ہیں ان کے لیے دعائے صحت کریں اور ساتھ ساتھ توبہ و استغفار اور دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ فرمادے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

اپنے اعمال کے درست کرنے کی فکر کرو، کچھ پتہ نہیں کہ کس عمل کی بدولت اللہ تعالیٰ ہمیں سزا میں مبتلا کردے، اس لیے یہ سب عبرت حاصل کرنے کے مقامات ہیں، اس عبرت کے ذریعے اپنے حالات کی اصلاح کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے تو اس میں ''رضا بالقضاء'' مطلوب ہے کہ جو فیصلہ میرے مالک نے کردیا، وہی برحق ہے، ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ اس لیے اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ''

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا، چاہے وہ روپے پیسے ہوں یا دنیا کے دوسرے واقعات ہوں، ان پر راضی ہو جاؤ اور راضی رہنے کا

مطلب ہے کہ اس کے خلاف کوئی شکوہ دل میں نہ ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تکوینیہ کے عین مطابق سمجھو ۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان ہی کی حکمت سے ہو رہا ہے، جب ان کی حکمت سے ہو رہا ہے تو تم اس پر راضی ہو جاؤ، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم نے رضامندی اختیار کر لی تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ ''غنی'' ہو جاؤ گے، اس لیے کہ تم نے اپنے فیصلے کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے تابع کر دیا۔ کائنات میں سب کچھ ان کے فیصلے سے ہو رہا ہے اور تمہیں ان کے فیصلوں پر کوئی شکوہ شکایت نہیں، لہٰذا تم سب سے غنی ہو گئے اور کسی کے محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہمیں رضا بالقضاء عطا فرمائے، اپنے ہر فیصلے پر راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور رضا بالقضاء کے جو ثمرات دنیا و آخرت میں ہیں اللہ تعالیٰ وہ تمام ثمرات ہمیں عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
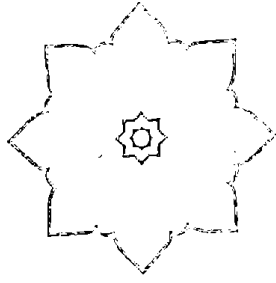
اللہ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو

(اصلاحی خطبات ج ۱۶ ص ۲۹۶)
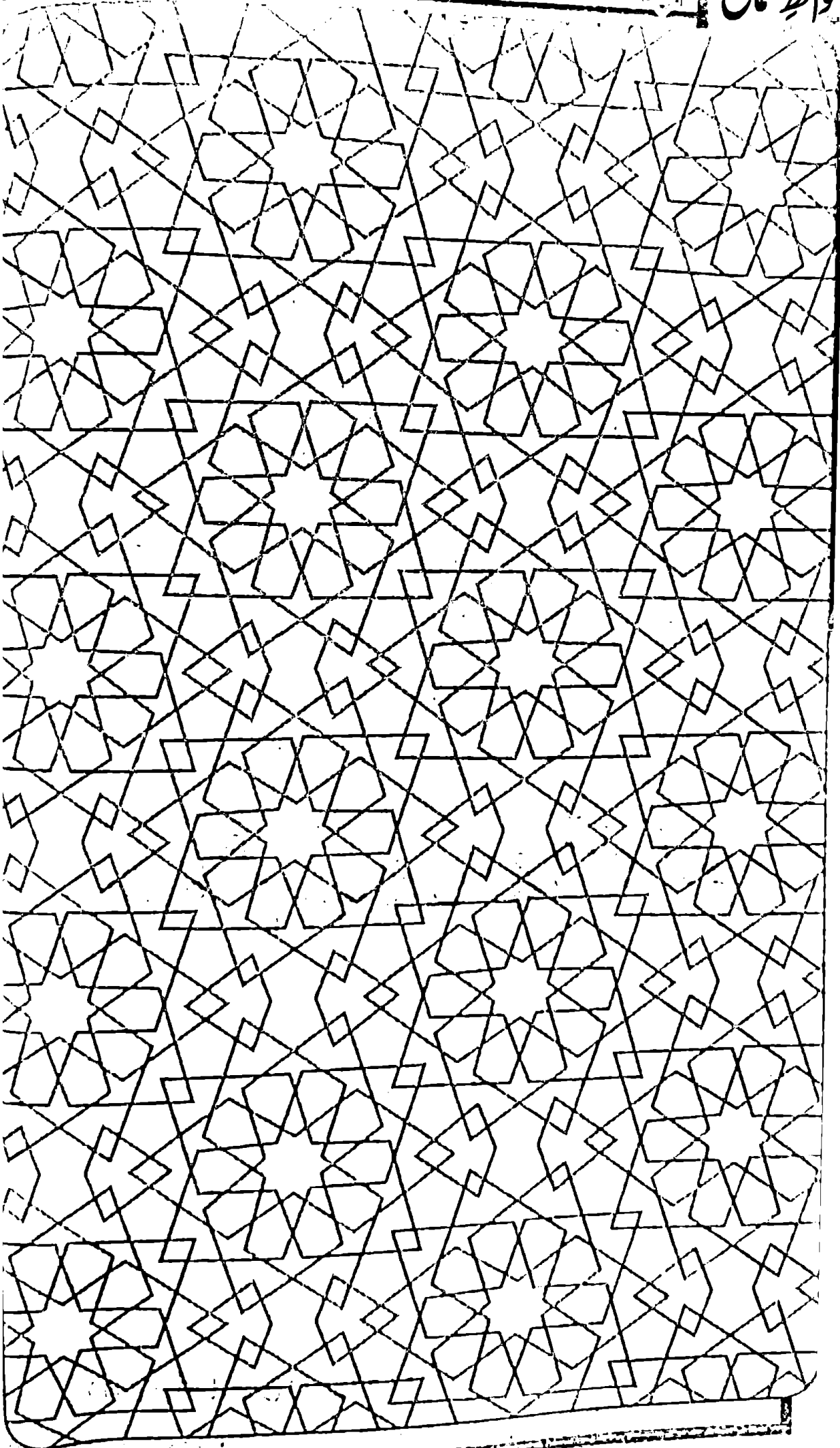
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِىْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ

فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ کَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ ۭ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ نِعْمَۃً ۭ وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۸﴾ (۱)

اٰمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالك من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان چل رہا ہے، گزشتہ دو تین جمعوں میں آیت نمبر چھ کی تفسیر آپ کے سامنے پیش کی تھی، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تمہارا فرض ہے کہ پہلے اس کی تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس غلط خبر کی بنیاد پر کسی شخص کو نقصان پہنچادو اور بعد میں تمہیں پشیمانی اور ندامت ہو۔ اس کا بقدرِ ضرورت بیان الحمدللہ پچھلے دو تین جمعوں میں ہو چکا۔

تمہاری رائے کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے سے مختلف ہونا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم بات کی طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو متوجہ فرمایا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے پوری امت مسلمہ کو متوجہ فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھو! کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود اور تشریف فرما

(۱) سورۃ الحجرات، آیت (۷،۸).

ہیں، اگر وہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرنے لگیں، یعنی جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرلیں تو تم مصیبت میں مبتلا اور پریشان ہوجاؤ گے۔ اس کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں جن میں تمہاری ذاتی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے سے مختلف ہوگی۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بات کا حکم دے رہے ہوں اور تمہاری سمجھ میں وہ بات نہ آرہی ہے یا ایسا ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک تقاضا پیدا ہو کہ یہ معاملہ یوں ہونا چاہیے اور تم نے اپنی وہ رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کردی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہاری وہ رائے نہیں مانی اور فرمایا کہ میں تمہاری رائے پر عمل نہیں کرتا، تو ایسی صورت میں یہ خیال دل میں پیدا ہوسکتا ہے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ فرمارہے ہیں یا آپ جس بات کا حکم دے رہے ہیں، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

خبر کی تحقیق کرلینی چاہیے

جیسا کہ وہ واقعہ جو میں نے گزشتہ آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے قبیلہ بنو المصطلق کی طرف بھیجا اور وہ صحابی غلط فہمی میں یہ سمجھ کر واپس آگئے کہ جن لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے جارہا ہوں، وہ میرے دشمن ہیں، وہ مجھے قتل کرنے کے لیے آبادی سے نکلے ہیں اور انہوں نے واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات بتادی تو اس وقت صحابہ کرام کو بہت جوش آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نمائندہ جس کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا اور ان لوگوں نے خود بلایا کہ ہمارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ایک آدمی بھیج دیں، پھر وہ لوگ ایسی

غداری کریں کہ اس قاصد کو قتل کرنے کے لیے آبادی سے باہر آجائیں، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت غصہ آیا اور بہت صدمہ پہنچا اور جوش خروش کے عالم میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ اب یہ لوگ اس لائق نہیں کہ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے، آپ فوراً ان پر چڑھائی کا حکم دیں اور ان پر حملہ کرکے ان سے جنگ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے ہمیں اس خبر کی تحقیق کرنی چاہیے، اس کے بعد کوئی اقدام کرنا چاہیے، چنانچہ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معاملے کی تحقیق کے لیے بھیجا۔

تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہوگئی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے بعض کے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ انہوں نے غداری کی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمائندے کی توہین کی ہے، لہٰذا اس بارے میں زیادہ تحقیق اور غور وفکر کی ضرورت نہیں تھی، براہِ راست ان پر حملہ کردینا چاہیے تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کی بات نہیں مانی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پہلے تحقیق کے لیے بھیجا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری بات مان لیتے اور فوراً حملہ کردیتے تو بے گناہ لوگ قتل ہوجاتے، کیونکہ حقیقت میں وہ لوگ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے ارادے سے شہر سے باہر نہیں نکلے تھے، بلکہ وہ تو ان کے استقبال کے لیے باہر نکلے تھے، وہ تو کسی نے آکر غلط خبر دے دی تھی کہ ان کے قتل کے ارادے سے نکلے ہیں [1]۔

---

(۱) تفسیر الطبری ۲۸۸/۲۲ طبع موسسة الرسالة و تفسیر ابن کثیر ۳۷۲/۷ طبع دار طیبة۔

رسول براہِ راست اللہ کی ہدایت پر چلتے ہیں

اگر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمہاری ہر بات کو مانا کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں ہی نقصان پہنچے گا اور تم خود ہی مشکل میں پڑ جاؤ گے اور مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک رسول بھیجا ہے، وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جن کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، جن پر صبح وشام وحی نازل ہو رہی ہے، جنہیں وہ باتیں بتائی جارہی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں، وہ احکام دیے جارہے ہیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آتے، اگر وہ تمہارے پیچھے چلنے لگیں اور جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرنے لگیں تو پھر رسول بھیجنے کا منشا ہی فوت ہوگیا، پھر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ رسول تو بھیجا ہی اس لیے جارہا ہے تاکہ وہ ان باتوں کے بارے میں تمہیں بتائیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں، اس لیے یہ نہ سمجھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی حکم یا آپ کا کوئی اِقدام یا آپ کا کوئی عمل تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو تم اس پر اعتراض کرنے بیٹھ جاؤ یا تمہارے دل میں اس پر شبہات پیدا ہونے لگیں۔ ارے! رسول تو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو بتائے جو تم خود اپنی سمجھ سے اور اپنی عقل سے سمجھ نہیں سکتے۔

عقل ایک حد تک صحیح فیصلہ کرتی ہے

دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے اور یہ عقل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اگر انسان اس کو صحیح استعمال کرے تو اس سے دنیا وآخرت کے بہت سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ عقل جو تمہیں دی گئی

ہے، یہ ساری کائنات کی تمام حکمتوں کا احاطہ کرسکتی ہے۔ یہ عقل بڑی کام کی چیز ہے، لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں، یہ لامحدود نہیں، ایک حد تک یہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے یہ کام کرنا بند کردیتی ہے۔ جیسے آنکھ ہے، یہ بڑے اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، لیکن ایک حد تک دیکھے گی، جہاں تک نظر آئے گا، اس سے آگے نہیں دیکھے گی۔ اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے، اس حد تک وہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے وہ کام نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور پیغمبر کو ان باتوں کی تعلیم کے لیے بھیجا ہے، جہاں انسان کی عقل کام نہیں کرسکتی، جہاں انسان کی عقل دھوکہ کھاسکتی ہے، ٹھوکر کھاسکتی ہے، اس موقع پر اللہ کا رسول ہی بتاتا ہے کہ وہ بات صحیح نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، بلکہ صحیح بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعے بتائی۔

رسول کا حکم مانو، چاہے عقل میں آئے یا نہ آئے

جب یہ بات ہے تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات بتائے یا کسی بات کا حکم دے اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا؟ اس حکم کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو ایسی صورت میں اگر تم اپنی عقل کے پیچھے چلو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول کو رسول ماننے سے انکار کردیا، رسول تو بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ جہاں تمہاری عقل کام نہیں کررہی تھی، وہاں پر رسول وحی کی رہنمائی سے تمہیں بہرور کرے۔ اس سے ہمیں یہ ہدایت ملی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کسی بات کا حکم دے دیں، چاہے قرآنِ کریم کے ذریعے حکم دیں یا حدیث کے ذریعے حکم دیں کہ فلاں کام کرو یا فلاں کام نہ کرو، تو اب

چاہے وہ حکم تمہاری سمجھ میں آرہا ہو یا نہ آرہا ہو، اس حکم کی علت اور اس کی حکمت اور فائدہ تمہاری سمجھ میں نہ آرہا ہو، پھر بھی تمہارے ذمے لازم ہے کہ اس پر عمل کرو۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (۱)

یعنی اللہ اور اللہ کا رسول جب کسی بات کا فیصلہ کردیں تو پھر کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔

اگر مومن ہے تو پھر اس حکم کو ماننا ہی ہوگا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میری عقل ناقص ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت کامل ہے، لہٰذا مجھے اس کے آگے سر جھکانا ہے۔

''حکمت'' اور ''فائدے'' کا سوال

آج ہمارے دور میں یہ ذہنیت بہت کثرت سے پھیلتی جارہی ہے کہ جب لوگوں کو شریعت کا کوئی حکم بتایا جائے کہ فلاں چیز حرام ہے، قرآنِ کریم نے اس کو منع کیا ہے یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو منع کیا ہے تو لوگ فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں منع کیا ہے؟ اس منع کرنے میں کیا حکمت اور کیا فائدے ہیں؟ گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہماری سمجھ میں اس کا فلسفہ نہیں آئے گا، اس کی حکمت اور فائدہ ہماری عقل میں نہیں آئے گا، اس وقت

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۳۶)۔

تک ہم اس حکم پر عمل نہیں کریں گے۔العیاذ باللہ العظیم- یہ ذہنیت عام ہو چکی ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو ذرا پڑھ لکھ گئے، تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تو اَب شریعت کے ہر حکم کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں، یہ کیوں ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ اور جب تک حکمت معلوم نہیں ہوتی اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

ایسا ''نوکر'' ملازمت سے نکال دینے کے قابل ہے

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے آگے ''کیوں'' کا سوال کرنا انتہاء درجے کی بے عقلی کی بات ہے، اس لیے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں اور ''بندہ'' بہت ادنیٰ درجے کی چیز ہوتی ہے۔ دیکھیے! ایک ہوتا ہے ''غلام'' اور ایک ہوتا ہے ''نوکر''۔ ان میں ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے اعلیٰ ''نوکر'' دوسرے درجے میں ''غلام'' اور تیسرے درجے میں ''بندہ''۔ اگر کسی نے کسی کو نوکر رکھا ہے تو وہ خاص کاموں کے لیے اور خاص اوقات کے لیے ہوتا ہے، وہ نوکر چوبیس گھنٹے کا غلام نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرے گا اور متعین کام کرے گا، اب اگر آپ نے نوکر سے کہا کہ آج بازار سے دس کلو گوشت لے آؤ، اب وہ نوکر آپ سے یہ سوال کرے کہ دس کلو گوشت کیوں لاؤں؟ آپ کے گھر میں دو افراد ہیں، ایک کلو گوشت بھی بہت ہوتا ہے، پہلے یہ بتائیں کہ یہ دس کلو گوشت کیوں منگوا رہے ہیں؟ پھر میں لاؤں گا۔ بتائیے! کیا وہ نوکر اس لائق ہے کہ اس کو گھر میں رکھا جائے؟ یا اس لائق ہے کہ کان سے پکڑ کر اُس کو باہر نکال دیا جائے؟ ارے بھائی! تیرا یہ کام نہیں تو ہم سے پوچھے کہ یہ چیز کیوں منگوا رہے ہو؟ تجھے اس لیے رکھا ہے کہ جب ضرورت

ہوگی تو باہر سے سودا منگوایا کریں گے، تم اگر کیوں کا سوال کرتے ہو تو تم نوکر رہنے کے لائق نہیں۔ حالانکہ وہ تمہارا نوکر ہے، تمہارا غلام نہیں ہے، تمہارا بندہ نہیں ہے، آپ بھی مخلوق ہیں، وہ بھی مخلوق ہے، آپ انسان ہیں، وہ بھی انسان ہے، آپ کے اندر بھی اتنی عقل ہے، جتنی عقل اس کے اندر ہے، اس کے باوجود آپ اس کے ''کیوں'' کا سوال گوارا نہیں کرتے۔

ہم اللہ کے ''بندے'' ہیں

جب کہ آپ تو اللہ کے بندے ہیں، نوکر نہیں ہیں، غلام نہیں ہیں، اللہ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اللہ آپ کا خالق ہے، آپ اس کی مخلوق ہیں اور آپ کی عقل اور اس کی حکمت میں کوئی مناسبت ہی نہیں، آپ کی عقل محدود ہے، اس کی حکمت اور سمجھ لامحدود ہے، جب وہ خالق و مالک یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، آپ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کیوں کروں؟ جب آپ اپنے نوکر سے یہ برداشت نہیں کرتے کہ وہ آپ سے کیوں کا سوال کرے تو اللہ تبارک تعالیٰ سے کیوں کا سوال کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم اپنے خالق سے، اپنے مالک سے، اپنے آقا سے، اپنے پیدا کرنے والے سے یہ پوچھ رہے ہو کہ وہ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں؟ یہ انتہا درجے کی بے غیرتی کی بات ہے، انتہاء درجے کی بے شرمی کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر کیوں کا سوال کیا جائے۔

''کیوں'' کا سوال بے عقلی کی دلیل ہے

یہ اور بات ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ حکمت تمہاری سمجھ میں بھی آجائے، لہٰذا اللہ اور اس

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سر جھکائے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا، اگر وہ کیوں کا سوال کرتا ہے تو وہ درحقیقت بے عقلی کا سوال ہے، اگر ہر بات تمہاری عقل میں آجایا کرتی اور اپنے ہر اچھے برے کو تم پہچان سکتے تو اللہ تعالیٰ کو نہ پیغمبر بھیجنے کی ضرورت تھی، نہ آسمان سے کوئی کتاب نازل کرنے کی ضرورت تھی اور نہ دنیا میں وحی کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت تھی، یہ سب اس لیے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تمہاری عقل چھوٹی سی اور بہت محدود ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک کی عقل کچھ کہہ رہی ہے اور دوسرے کی عقل کچھ کہہ رہی ہے، ایک کی عقل میں ایک بات آرہی ہے اور دوسرے کی عقل میں نہیں آرہی، یہ سب عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم اسی جگہ بھیجتا ہے جہاں عقل کی پرواز رُک جاتی ہے، اس لیے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ نہ تو یہ ہونا چاہیے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے بارے میں یہ سوال کرو کہ یہ کیوں دیا جارہا ہے؟ اور یہ حکم ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے اور اس کے نتیجے میں اس حکم کو چھوڑ بیٹھو اور نہ یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ تمہاری سمجھ میں آرہا ہے، اللہ کا رسول اس کو مانتا رہے کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ درست ہے۔

آج کل کے لیڈروں کا حال

آج کل لیڈروں کا معاملہ الٹا ہوگیا ہے ''لیڈر'' یا ''قائد'' اس کو کہا جاتا ہے جو قوم کو لے کر چلے اور ان کی رہنمائی کرے۔ اگر ساری قوم ایک غلط راستے پر جارہی ہے اور وہ لیڈر جانتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جارہی ہے تو وہ ان کو بتائے گا کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے، صحیح راستہ یہ ہے، لیکن آج کا قائد اور رہنما عوام کے پیچھے چلتا ہے، جس سے عوام خوش ہوجائے، جس سے اس کو عوام کے ووٹ مل

جائیں، لہٰذا بعض اوقات وہ جانتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، مصلحت کے مطابق نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کو عوام کی رضا مندی مطلوب ہوتی ہے، اس لیے وہ ویسا ہی کرتا ہے جیسا عوام چاہتے ہیں۔

''صلحِ حدیبیہ'' میں دب کر صلح کیوں کی گئی؟

صلحِ حدیبیہ کے واقعے کو دیکھیے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوش وخروش کی حالت میں ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور کفار سے مقابلہ کرکے ان کو شکست دے سکتے ہیں تو پھر دب کر صلح کیوں کی جارہی ہے، لیکن اللہ کا رسول ڈٹا ہوا ہے کہ اس وقت اللہ کا حکم یہی ہے صلح کرلو، چاہے بظاہر دب کر صلح ہوتی نظر آرہی ہو، تب بھی یہی کرنا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چاہتے تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر فرما دیتے کہ چلو، جنگ کرو، لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ صلح ہوجائے۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی باتوں کو آپ نے رد کردیا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسے انسان تڑپتے پھر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ کیا ہوگیا؟ ہم اتنی دب کر دشمن سے صلح کررہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جاتے ہیں اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہورہا ہے؟ لیکن اللہ کا رسول اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی وحی کے ذریعے اس کو یہی حکم ملا ہے۔

خلاصہ

بہرحال! یہ آیتِ کریمہ یہ سبق دے رہی ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی حکم آجائے یا آپ کا کوئی فیصلہ آجائے تو محض سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اس کے خلاف شکوک وشبہات کو دل میں جگہ نہ دو، صحیح راستہ

وہی ہے جو انہوں نے بتایا، اگر وہ تمہاری ہر بات ماننے لگیں گے تو تم خود پریشانی میں مبتلا ہوجاؤ گے، تم خود دکھ اٹھاؤ گے، انجام کار تمہارے لیے نقصان کا سبب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ہمارے دلوں میں ذہن نشین فرمادے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہی درحقیقت بلند وبالا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ میں آ رہا ہو یا نہ آ رہا ہو، اگر ہمیں یہ بات حاصل ہوجائے تو بے شمار اشکالات اور شبہات اور وسوسے جو دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب ختم ہوجائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
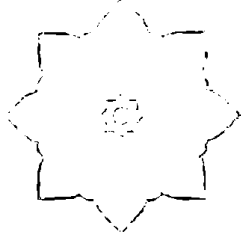
جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے

(اصلاحی خطبات ج ۱۸ ص ۲۶۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بعدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِکِ النَّاسِ ۝ اِلٰہِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۝ (۱)

(۱) سورۃ الناس.

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ
النبی الکریم ونحن علی ذلک من الشاھدین
والشاکرین والحمد للہ ربّ العالمین

تمہید

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! یہ قرآنِ کریم کی آخری سورت ہے جس کی کچھ تشریح کا بیان پچھلے چند جمعوں سے چل رہا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے، قرآنِ کریم کی آخری دو سورتیں "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس وقت نازل[1] ہوئی تھیں جب کچھ یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کرنے کی کوشش کی تھی، تو اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تلقین فرمائی گئی کہ آپ ان دو سورتوں کے الفاظ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگیے، پہلی سورت "سورۃ الفلق" تھی، جس کا بیان بقدرِ ضرورت ہو چکا ہے، دوسری سورت یہ "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ہے جس کو "سورۃ الناس" کہا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حق تعالیٰ فرما رہے ہیں "قل" آپ کہیے، کیا کہیے؟ "اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" میں پناہ مانگتا ہوں تمام انسانوں کے پروردگار کی، "مَلِكِ النَّاسِ" تمام انسانوں کے بادشاہ کی، "اِلٰهِ النَّاسِ" تمام انسانوں کے معبود کی، اس سے مراد تو حق تعالیٰ ہیں، لیکن یہاں تین صفتیں ذکر فرمائیں کہ جو سارے انسانوں کا پروردگار ہے اس کی، جو سارے انسانوں کا بادشاہ ہے اس کی، جو سارے انسانوں کا معبود ہے اس کی "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ" اس کی پناہ

(۱) أسباب النزول للواحدی ص ۴۷۳، طبع دار الإصلاح الدمام.

مانگتا ہوں اس شیطان کے شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے "من الجنة والناس" چاہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو، یہ اس سورت کا ترجمہ ہے۔

میری پناہ مانگو

پچھلے دو جمعوں میں اس کی تشریح میں عرض کر چکا ہوں، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جب کبھی کوئی وسوسہ، کوئی برا خیال، گناہ کا ارادہ، گناہ کی خواہش یا اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں کوئی بد گمانی -العیاذ باللہ- کا کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ بندے کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے یا اللہ! میں اس وسوسے کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، اس میں ہر قسم کا وسوسہ داخل ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ خود فرمایا ہے کہ میری پناہ مانگو تو یقیناً جو اس پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی پناہ عطا فرمائیں گے، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کریم ذات کسی سے کہے کہ تم میری پناہ مانگو اور جب وہ پناہ مانگے تو کہے کہ بھاگ جاؤ، میں تمہیں پناہ نہیں دیتا، ایک معمولی شریف آدمی بھی یہ کام نہیں کرسکتا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جو رحمن و رحیم ہے اس سے یہ کیسے ممکن ہے؟

قرآنِ کریم کی دعا رد نہیں ہوسکتی

اسی لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم میں جو دعائیں بتائی گئی ہیں کہ یہ دعا مانگو، یہ دعا مانگو، ان دعاؤں کا رد ہونے کے امکان ہی نہیں، کیونکہ جب خود اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۱)

یہ کہو اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

تو جب اللہ تعالیٰ خود کہہ رہے ہیں کہ یہ کہو، یعنی درخواست کا مضمون بتا رہے ہیں، جب کسی کے سامنے درخواست پیش کی جاتی ہے، اس میں ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی اپنے الفاظ میں پیش کرے، دوسری شکل یہ ہے کہ جس کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ خود بتا رہا ہے کہ ان الفاظ سے مجھے درخواست دو، تو وہ کیسے رد ہوگی؟ اس واسطے جب انسان اللہ کی پناہ مانگے گا اس قسم کے تمام وساوس کے شر سے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ضرور پناہ عطا فرمائیں گے، بشرطیکہ سچے دل سے مانگے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ لی

دیکھیے! حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے، زلیخا نے ان پر ڈورے ڈالے اور چاروں طرف سے دروازے بند کر دیے اور گناہ کی دعوت دی۔ جس کو دعوت دی جارہی تھی وہ بھی انسان تھا، بشر تھا، اس کے دل میں بھی بشری تقاضے اور بشری خواہشات موجود تھیں، وہ فرشتہ نہیں تھا، چنانچہ قرآنِ کریم کہتا ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (۲)

---

(۱) سورۃ المومنون آیت (۱۱۸)۔
(۲) سورۃ یوسف آیت (۲٤)۔

بڑی عورت نے تو ارادہ کر ہی لیا تھا اور یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی کچھ کچھ خیال آ چلا تھا، اگر اللہ کی دلیل
نہیں دیکھ لی ہوتی۔

وہ بشر تھے اگر خیال نہ آتا اور خواہش نہ پیدا ہوتی اور بچ جاتے تو کوئی کمال کی بات نہیں تھی، لیکن بھرپور جوانی ہے، بشری تقاضے پوری طرح موجود ہیں، قوت اور طاقت موجود ہے اور دل میں خواہش بھی پیدا ہو رہی ہے، لیکن اس کے بعد بھی بچے، یہ ہے کمال جو پیغمبروں کا کمال ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے دو کام کیے، ایک کام یہ کیا جو دل میں خیال آ چلا تھا اللہ سے اس کی پناہ مانگی، اے اللہ! میرے دل میں یہ خیال آنے لگا ہے، حالات ایسے ہو گئے ہیں، اگر آپ نے نہ بچایا تو میں بچ نہیں سکوں گا، تو پناہ مانگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اور دوسرا کام یہ کیا کہ میرے بس میں اتنا ہے کہ دروازے تک بھاگ جاؤں، اپنے بس میں جتنی بچنے کی کوشش تھی وہ پوری کر لی اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی ہے کہ میں بھاگ کر دروازے تک چلا جاؤں، معلوم بھی ہے کہ دروازے پر تالے پڑے ہوئے ہیں، میں بھاگ کر باہر نہیں نکل سکتا، لیکن میرے بس میں اتنا ہے کہ میں دروازے تک پہنچ جاؤں، تو کسی طرح بھاگ کر دروازے تک پہنچ گئے، جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیکھا کہ بندے نے اپنا کام پورا کر لیا، جتنا بھاگ سکتا تھا بھاگ گیا اور پھر میری پناہ مانگ لی تو اب میرا کام ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دروازے کے تالے توڑ دیے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی عورت نے تو ارادہ کر ہی لیا تھا گناہ کرنے کا، ان کے دل میں بھی کچھ کچھ خیال آ چلا تھا، اگر اللہ کی دلیل نہیں دیکھ لی ہوتی۔

وہ بشر تھے اگر خیال نہ آتا اور خواہش نہ پیدا ہوتی اور بچ جاتے تو کوئی کمال کی بات نہیں تھی، لیکن بھرپور جوانی ہے، بشری تقاضے پوری طرح موجود ہیں، قوت اور طاقت موجود ہے اور دل میں خواہش بھی پیدا ہورہی ہے، لیکن اس کے بعد بھی بچے، یہ ہے کمال جو پیغمبروں کا کمال ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے دو کام کیے، ایک کام یہ کیا جو دل میں خیال آ چلا تھا اللہ سے اس کی پناہ مانگی، اے اللہ! میرے دل میں یہ خیال آنے لگا ہے، حالات ایسے ہوگئے ہیں، اگر آپ نے نہ بچایا تو میں بچ نہیں سکوں گا، تو پناہ مانگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اور دوسرا کام یہ کیا کہ میرے بس میں اتنا ہے کہ دروازے تک بھاگ جاؤں، اپنے بس میں جتنی بچنے کی کوشش تھی وہ پوری کرلی اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی ہے کہ میں بھاگ کر دروازے تک چلا جاؤں، معلوم بھی ہے کہ دروازے پر تالے پڑے ہوئے ہیں، میں بھاگ کر باہر نہیں نکل سکتا، لیکن میرے بس میں اتنا ہے کہ میں دروازے تک پہنچ جاؤں، تو کسی طرح بھاگ کر دروازے تک پہنچ گئے، جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیکھا کہ بندے نے اپنا کام پورا کرلیا، جتنا بھاگ سکتا تھا بھاگ گیا اور پھر میری پناہ مانگ لی تو اب میرا کام ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دروازے کے تالے توڑ دیے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؂

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

اگر تمہیں گناہوں سے نکلنے کا راستہ نظر نہ آرہا ہو تو جہاں تک بھاگ سکتے ہو بھاگ جاؤ اور پھر اللہ سے مانگو کہ یا اللہ! میرا کام اتنا ہی تھا آگے تیرا کام ہے۔

جنگِ آزادی کا ایک واقعہ

میں نے اپنے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب انگریزوں کے خلاف لڑائی ہورہی تھی تو جگہ جگہ پھانسیاں لگائی ہوئی تھیں، لوگوں کو پھانسیاں دی جارہی تھیں اور ظلم وتشدد کا بازار گرم تھا، آج ہمیں یہ تشدد پسند کہتے ہیں، لیکن ان کی تاریخ ظلم و بربریت سے بھری ہوئی ہے، بربریت کا بازار گرم تھا۔ اسی میں ایک اللہ والے ایک گھر میں ان لوگوں کے شر سے اپنے آپ کو بچا کر ٹھہرے ہوئے تھے، کئی دن اسی حالت میں گزر گئے، نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو کچھ تھا، باہر نکل نہیں سکتے تھے، باہر نکلتے تو انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے، جب کئی دن گزر گئے اور بالکل جان لبوں تک آگئی تو سوچا کہ کیا کروں؟ پانی ہے نہیں، پیاس شدید لگی ہوئی ہے، جان پر بنی ہوئی ہے، تو دل میں یہ سوچا کہ جتنا میرے بس میں کام ہے وہ تو کرلوں اور پھر اللہ سے مانگوں، تو پاس ایک پیالہ پڑا ہوا تھا اور بھوک پیاس کی کمزوری سے چلنا ممکن نہیں تھا، پیالے کو ہاتھ میں لے کر سرک سرک کر صحن تک پہنچ گئے اور صحن میں لے جاکر پیالہ رکھ دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں سرک کر پیالہ یہاں رکھ دوں، اب بارش نازل کرنا آپ کا کام ہے، اپنے فضل سے آسمان سے مجھے اس میں پانی عطا فرما دیجیے، یہ دعا کی، جب بندہ نے اپنا کام پورا کرلیا اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہاں اب میرا کام ہے، بادل آئے، بارش برسی اور پیالہ پیانی سے بھر گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگنے

کے ساتھ ساتھ آدمی اپنے کرنے کا کام کر لے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے، جتنی گناہ سے بچنے کی کوشش ہوسکتی ہے وہ کر لے پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ وہ رد کر دیں۔

اس سورت میں یہی سکھایا گیا ہے

تو یہ سکھایا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں کہ اپنا کام کرو اور پھر میری پناہ مانگو اور شیطان سے پناہ مانگو، نفس کے شر سے پناہ مانگو، کوئی برا ساتھی مل گیا ہے وہ غلط راستے پر چلا رہا ہے، وہ بھی اس میں شامل ہے، وہ دلوں میں غلط باتیں ڈال رہا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے میری پناہ مانگو۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی یا اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں "من صاحب السوء"(۱) برے ساتھی سے، جس کی صحبت مجھے خراب کردے میں اس سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ پناہ مانگنے کی عادت ڈالو اللہ تبارک وتعالیٰ سے، ہر برے کام سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگو۔

نمازِ حاجت پڑھ کر

یہاں یہ بات بھی عرض کردوں کہ پناہ مانگنے کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے مدد مانگنے کا سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی براہِ راست اللہ سے مانگے، نمازِ حاجت پڑھے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) كتاب الدعاء للطبرانی ۳۹۹/۲ (۱۳۳۸) طبع دار البشائر الاسلامية. والمعجم الكبير للطبرانی ۲۹٤/۱۷ (۸۱۰) وقال الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۲۲۰/۷ (۱۱۹٦۱) رواه الطبرانی، ورجاله ثقات. طبع مكتبة القدسی. القاهرة.

نے فرمایا کہ جب تمہیں کوئی بھی حاجت پیش آئے، کوئی بھی ضرورت پیش آئے، کوئی مشکل پیش آجائے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور اُسے پیش کرنا ہو تو دو رکعتیں نماز حاجت کی نیت سے پڑھو اور نماز پڑھ کر پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو، اس کے کچھ الفاظ بھی حدیث میں آئے ہیں، وہ یاد کر لیے جائیں تو اچھا ہے، یہ دعا مناجاتِ مقبول میں بھی لکھی ہوئی ہے اور مسنون دعاؤں کی کتابوں میں بھی لکھی ہوئی ہے، یہ یاد کر لو تو اچھا ہے، لیکن بالفرض یاد نہ بھی ہو تو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم" کہہ کر اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور وہ حاجت پیش کرو کہ یا اللہ! مجھے یہ حاجت پیش آرہی ہے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ عطا فرما دیجیے، یہ نماز حاجت پڑھ کر دعا مانگنے کا طریقہ تمام حاجات، تمام مشکلات کو حل کرنے کے لیے سب سے زیادہ افضل، موجبِ ثواب اور سب سے زیادہ مؤثر ہے، یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی۔ (۱)

ہر چیز کا ایک تعویذ ہوتا ہے

میں یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آج کل ہمارے ماحول میں جب کوئی حاجت پیش آتی ہے یا جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو لوگ تعویذ گنڈے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، کہ کوئی تعویذ بتادو یا دے دو تو تعویذ کی فکر زیادہ ہوتی ہے اور

---

(۱) سنن الترمذی۱/۴۸۹ (۴۷۹) وقال: هذا حديث غريب، وفی اسناده مقال، فائد بن عبد الرحمن يضعف فی الحديث، وفائد هو ابو الورقاء. والزہد لابن المبارک ۱/۳۸۲ (۱۰۸٤) والمستدرك على الصحيحين للحاكم ۱/٤٦٦ (۱۱۹۹) وقال: فائد بن عبد الرحمن، عداده فی التابعين، وقد رايت جماعة من اعقابه، وهو مستقيم الحديث، الا ان الشيخين لم يخرجا عنه، وانما جعلت حديثه هذا شاهدا لما تقدم۔

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے نماز حاجت پڑھ کر دعا کرنے کو کچھ سمجھتے ہی نہیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو طریقہ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ دو رکعت پڑھو اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرو، یہ سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے، اس میں ثواب بھی ہے، اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا فائدہ بھی ہے اور ساتھ ساتھ مؤثر بھی سب سے زیادہ ہے، تعویذ گنڈے سے زیادہ مؤثر ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں تعویذ گنڈے کو سب سے زیادہ مؤثر سمجھ لیا گیا ہے اور لوگوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بھائی ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی تعویذ ہونا چاہیے، فلاں چیز کا تعویذ دے دو، فلاں چیز کا تعویذ دے دو، یہاں تک کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک عورت آئی اور آ کے اُن کے سر ہوگئی کہ جی میری مانگ صحیح نہیں نکلتی، جب میں بال بناتی ہوں تو ٹیڑھی نکلتی ہے، کنگھی کرتی ہوں تو مانگ سیدھی نہیں نکلتی، تو کوئی تعویذ ایسا دے دو کہ مانگ سیدھی نکلا کرے، انہوں نے کہا کہ اس کا کوئی تعویذ ہے ہی نہیں، اس نے کہا نہیں، اس کا کوئی تعویذ دے دو، آپ عالم آدمی ہو اور کوئی تعویذ دے دو، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عالم جو ہوتا ہے وہ سارا علم دین پڑھتا ہے وہ سارا علم تعویذ گنڈے کے لیے پڑھتا ہے، جس کو تعویذ گنڈے نہیں آتے وہ عالم ہی نہیں ہے، تو آج کل لوگوں کے ذہن میں علم منحصر ہوگیا ہے، خاص طور سے خواتین کے ذہن میں کہ اگر یہ عالم ہے تو کوئی نہ کوئی تعویذ نکالے گا اور ایسا دے گا کہ جس سے میرا مقصد حاصل ہوجائے۔

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تعویذ نہیں دیا

خوب سمجھ لیجیے کہ ساری زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تعویذ نہیں دیا، ہاں

کبھی کبھی جھاڑ پھونک کی ہے، کیونکہ قرآن نے یہ کہا کہ "قُلْ" کہو، زبان سے کہو، تو بعض اوقات بیماروں کے اوپر جھاڑ پھونک کی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ اشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَائُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا"(۱)

پڑھ کر دم کر دیا اور فرمایا:

"اَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ"(۲)

یہ کہہ کر دم کر دیا اور اس طرح کے کچھ ذکر ہیں ان کو پڑھ کر دم کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔

ان دعاؤں کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جو سارے انسانوں کا پروردگار ہے یہ بیماری دور فرما: اَنْتَ الشَّافِيْ. آپ ہی شفا دینے والے ہیں: لَا شِفَاءَ اِلَّا شَفَائُكَ. آپ کے سوا کوئی شفا نہیں دے سکتا: شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا ۔ ایسی شفا دے دیجیے جس کے بعد کوئی بیماری باقی نہ رہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے: اَسْئَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ ۔ میں اس عظمت والے اللہ سے سوال کرتا ہوں جو سارے عرش کا مالک ہے کہ وہ آپ کو شفاء دے دے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی چیزوں کے لیے جھاڑ تو کی ہے، دم تو کیا ہے، لیکن تعویذ لکھ کر کسی کو نہیں دیا، نہ کسی صحابی سے کہا کہ تم اس کو لکھ کر دے دو۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۳۲/۷ (۵۷۴۲) وصحیح مسلم ۱۷۲۱/٤ (۲۱۹۱)۔

(۲) سنن ابی داود ۱۸۷/۳ (۳۱۰۶) وسنن الترمذی ۵۹۳/۳ (۲۰۸۳) وقال: هذا حديث حسن، لا نعرفه الا من حديث المنهال بن عمرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعویذ لکھنا

البتہ جو لوگ زبان سے خود نہیں پڑھ سکتے ان کے لیے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کیا کہ ان کو تو زبان سے یاد نہیں رہے گا کہ یہ پڑھے اور اپنے اوپر دم کرے، لاؤ اس کو لکھ کر دے دیں تو یہ باندھ لے، اپنے بازو پر باندھ لے، یا گلے میں ڈال لے، یہ بعض صحابہ سے منقول ہے، لہٰذا وہ ناجائز نہیں ہے، کوئی قرآنی آیات کا تعویذ گلے میں ڈال لے تو ناجائز نہیں ہے، لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ وہی تعویذ جائز ہے جس میں یا تو قرآنِ کریم کی آیات ہوں یا اس میں کوئی دعا ہو، ذکر ہو، اس کے معنی سمجھ میں آتے ہوں۔

ایسے تعویذ حرام ہیں

ایسے تعویذ جس میں ایسی عبارت لکھی ہوئی ہے، ایسی بات لکھی ہوئی ہے، جس کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تو ایسا تعویذ استعمال کرنا ناجائز ہے، بعض تعویذ ایسے ہوتے ہیں جس میں غیر اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے، وہ چاہے نبی ہو، چاہے ولی ہو اور چاہے کتنا بڑا بزرگ ہو، اللہ کے سوا کسی سے مراد نہیں مانگی جاتی اور وہ انسان کو شرک کے قریب پہنچا دیتی ہے، ایسے تعویذ بالکل حرام ہیں اور انسان کو شرک کے قریب پہنچا دیتے ہیں، اسی لیے فقہائے کرام نے فرمایا کہ تعویذ میں اگر کوئی ایسی بات لکھی ہوئی ہے جو ہم اور آپ سمجھتے نہیں ہیں تو کیا پتہ اس میں کوئی غیر اللہ سے مدد مانگ لی گئی ہو، کوئی شرک کا کلمہ اس کے اندر موجود ہو، اس واسطے ایسا تعویذ استعمال کرنا بالکل جائز نہیں ہے، لیکن اگر قرآنِ کریم کی آیات ہیں، ان کو بھی ادب کے ساتھ استعمال کیا جائے یا کوئی ذکر ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یا کوئی دعا ہے جو تعویذ میں لکھ دی گئی تھی تو وہ جائز ہے، لیکن اس میں کوئی ثواب نہیں۔

تعویذ دینا روحانی علاج نہیں

لوگ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ یہ تعویذ گنڈے کرتے ہیں گویا یہ روحانی علاج ہے، اس کا نام روحانی علاج رکھا ہوا ہے، یہ کوئی روحانی علاج نہیں ہے، وہ ایسا ہی علاج ہے جیسا کہ آپ حکیم کے پاس گئے، ڈاکٹر کے پاس گئے، ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس گئے، ایسے ہی کسی عامل کے پاس چلے گئے، اس کو روحانی علاج کہنا ہی غلط ہے، وہ بھی جسمانی علاج ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے، نہ کوئی ثواب ہے، نہ کوئی تقدس اس سے وابستہ ہے، بس ایک جائز کام ہے۔

تلاوت کا ثواب نہیں ملے گا

اور یہ بھی سمجھ لیں، کہ اگر کسی خاص مقصد کے لیے آدمی قرآن کی آیت پڑھتا ہے تاکہ میری بیماری دور ہوجائے، میرا قرضہ ادا ہوجائے، مجھے روزگار مل جائے، میری اولاد ہوجائے تو اس میں تلاوت کا ثواب نہیں ملتا، وہ ٹھیک ہے کہ جائز ہے، لیکن تلاوت کا ثواب اس وقت ملتا ہے جب خالص اللہ کے لیے پڑھے، اللہ کے لیے پڑھے گا تلاوت کرے گا تو ثواب ملے گا، لیکن اگر وہ کسی ذاتی مقصد کے لیے پڑھ رہا ہے تو جائز ہے، کوئی گناہ بھی نہیں ہے، لیکن اس پر ثواب نہیں ملے گا، یہ غلط فہمیاں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔

علاج کا صحیح طریقہ

جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ "(۱) پڑھو اور جو طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ دعا کرو اللہ تبارک وتعالیٰ سے اور دعا ایسی چیز ہے کہ اگر دنیاوی مقصد کے لیے بھی کر رہے ہو تو اس پر بھی ثواب ہے، اگر کوئی دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ میرا قرضہ ادا فرما دیجیے، یا اللہ مجھے روزگار دلوا دیجیے، یا اللہ مجھے اولاد دے دیجیے یا اللہ مجھے بیماری سے شفا دے دیجیے، مانگ رہے ہو اپنے لیے، لیکن ہر دعا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب لکھا جارہا ہے، یہ عبادت ہے، لیکن تعویذ گنڈے تو کوئی عبادت نہیں ہے، ہاں جائز ہے، جیسے اور علاج کرتے ہو یہ بھی علاج ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر چیز کا حل تعویذ گنڈے سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو تعویذ گنڈا دے وہ بہت بڑا عالم ہے اور وہ بہت بڑا پیر ہے اور اگر نہ دے تو سمجھیں گے کہ اس نے تو زندگی برباد کر دی، کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں۔

عجیب وغریب تعویذ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور آکر کہنے لگا کہ کوئی تعویذ دے دو فلاں چیز کا، حضرت نے فرمایا کہ مجھے نہیں آتا اس کا کوئی تعویذ، میں دعا کروں گا، کہنے لگا کہ نہیں تعویذ دو تو حضرت نے فرمایا کہ دعا آتی ہے مجھے، تعویذ نہیں آتا مجھے، وہ پیچھے ہی پڑ گیا، دیہاتی آدمی تھا، حضرت نے سوچا کہ دیہاتی آدمی ہے اس کو میں رد کروں گا، تو اس کا دل ٹوٹے گا تو اللہ تعالیٰ

---

(۱) سورۃ الناس آیت (۱)۔

سے دعا کر کے ایک تعویذ لکھ دیا اور اردو میں لکھ دیا کہ ''یا اللہ میں جانتا نہیں، یہ مانتا نہیں، آپ اپنے فضل وکرم سے اس کی مراد پوری فرمادیجیے'' یہ دعا لکھ کر دے دی، اللہ تعالیٰ نے اسی سے فائدہ کر دیا۔

تعویذ کی ابتداء

یہ تعویذ نہ قرآن میں آئے اور نہ حدیث میں آئے، لیکن پیدا اسی لیے ہوئے کہ کسی بزرگ نے کو بات کوئی کلمہ لکھ کردے دیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں تاثیر پیدا کردی فائدہ ہوگیا، تو لوگوں نے کہا کہ یہ فلاں چیز کا تعویذ ہوگیا، یہ بخار کا تعویذ ہے، یہ سر کے درد کا تعویذ ہے، اس طرح تعویذ پیدا ہوگئے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب کبھی انسان کو کوئی حاجت، کوئی مشکل، کوئی پریشانی آئے تو جو طریقہ قرآن نے بتایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، اس کی طرف زیادہ توجہ دو اور اس کو زیادہ اہم سمجھو، اس کو زیادہ مؤثر سمجھو اور دوسری چیزوں کو اس کے مقابلے میں کمتر سمجھو، اب الٹا سمجھ لینا کہ تعویذ کو دعا سے افضل سمجھ لینا کہ ہر چیز کا ایک تعویذ ہوتا ہے تو یہ خیال ایک غلط خیال ہے اور یہ قرآن وسنت کو صحیح مرتبہ نہ دینے کے مترادف ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے زیادہ مؤثر نہ تعویذ ہے، نہ گنڈا ہے، نہ کوئی اور جھاڑ پھونک ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا ہے اس کو یاد کرلو، نمازِ حاجت اور اس کے بعد کی جو دعا ہے، اس دعا کو یاد کرکے ہر مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
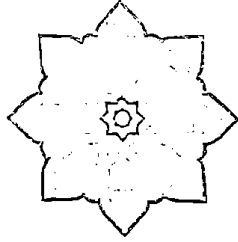
تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کی شرعی حیثیت

(اصلاحی خطبات ج ۱۵ ص ۲۹)
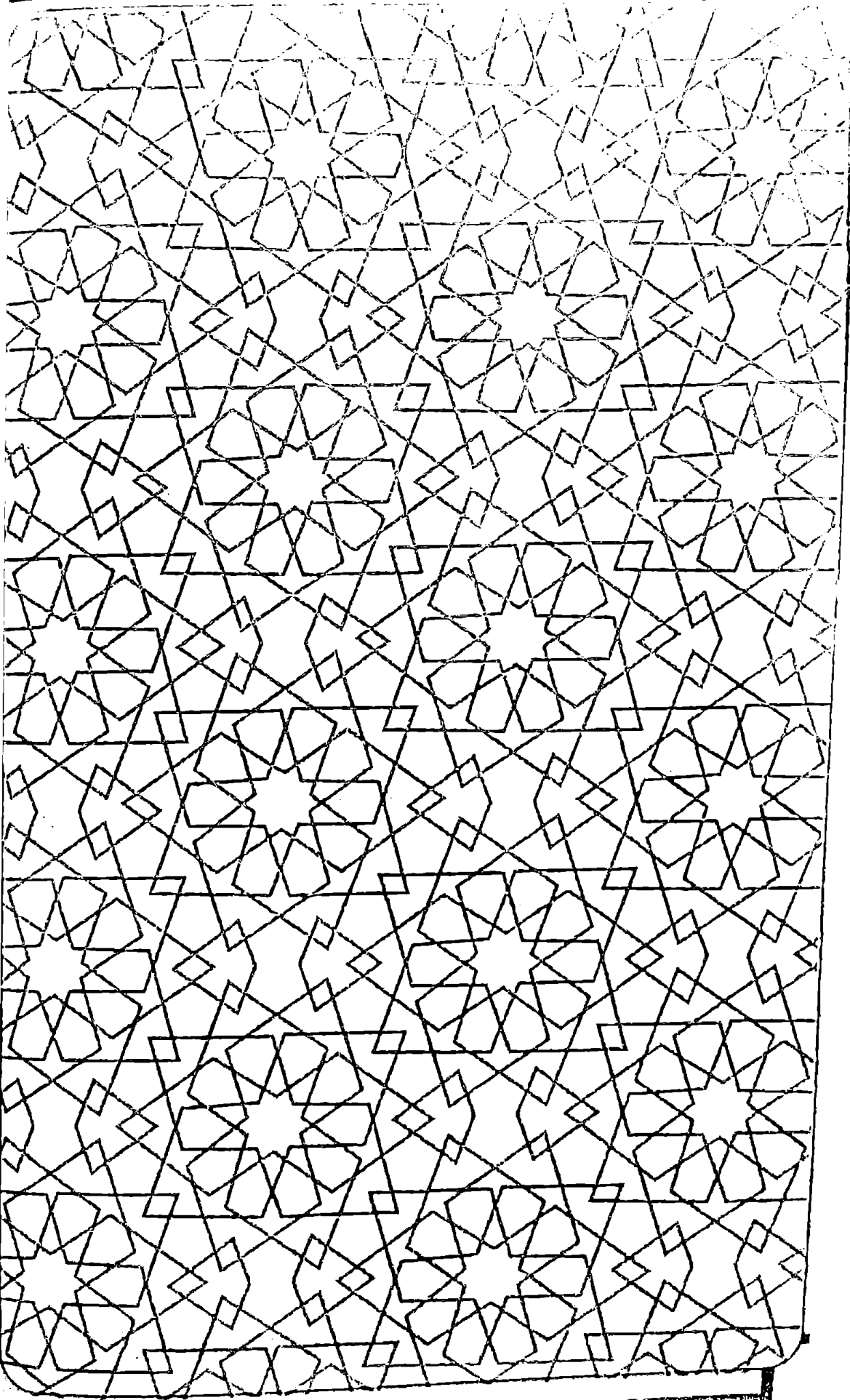
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کی شرعی حیثیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کثرت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے سامنے موسمِ حج کے موقع پر ساری امتیں پیش کی گئیں۔ یعنی بذریعہ کشف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھلی تمام امتیں دکھائی گئیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی امت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت اور دوسرے انبیاء علی نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کی امتیں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کی گئیں اور ان کے ساتھ امتِ محمدیہ بھی آپ کے سامنے پیش کی گئی۔ تو مجھے اپنی امت کی تعداد جو کہ بہت بڑی تھی، اس کو دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ [1] اس لیے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے امتیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، جتنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی تعداد تھی۔

کثرتِ امت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشی

دوسری روایت میں یہ تفصیل ہے کہ جب گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی امتیں آپ کے سامنے پیش کی جانے لگیں تو بعض انبیاء کی امت میں دو تین آدمی تھے، کسی کے ساتھ دس بارہ تھے، اس لیے کہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والے چند محدود افراد تھے، بعض انبیاء پر ایمان لانے والے دس بارہ افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے سو افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے ہزار تھے۔ جب یہ امتیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو آپ کو ایک بڑا گروہ نظر آیا، آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی امت تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی، پھر بعد میں آپ کے سامنے ایک اور بڑا گروہ پیش کیا گیا جو سارے میدان پر چھا گیا اور

---

(۱) مسند احمد ۳۵۸/۷ (۴۳۳۹) واوردہ الہیثمی فی "مجمع الزوائد" ۳۰۴/۹ (۱۵۶۶۵) وقال: رواہ احمد مطولا ومختصرا، ورواہ ابو یعلی کذلک، ورجالہما فی المطول رجال الصحیح۔ وروی البخاری ۱۳۶/۷ (۵۷۰۵) ومسلم ۱۹۹/۱ (۲۲۰) من حدیث عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

سارے پہاڑوں پر چھا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت ہے۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کیا گیا کہ یامحمد! اَرَضِیتَ؟ کیا آپ راضی ہو گئے؟ یعنی کیا اس سے خوش ہیں کہ آپ کی امت کی اتنی بڑی تعداد جو کسی اور پیغمبر کی امت کی نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا: نَعَمْ: یَارَبِّی! ہاں اے میرے پروردگار، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ، میری امت کے اندر لوگوں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے [1]۔

ستر ہزار افراد کا بلا حساب جنت میں دخول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوش خبری سنائی کہ

"اِنَّ مَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعِينَ اَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ"

یعنی یہ جو امت آپ کی نظر آ رہی ہے اس میں ستر ہزار افراد ایسے ہیں جو بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے، ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ پھر اس کی شرح فرمائی کہ وہ لوگ جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر یہ چار صفتیں ہوں گی۔

چار اوصاف والے

پہلی صفت یہ ہے کہ "هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ"؛ یعنی وہ لوگ جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگ بیماری کا علاج داغ لگا کر

(۱) مسند احمد ۳۵۷/۷ (۴۳۳۹)۔

نہیں کرتے، اہلِ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی بیماری کا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا تھا تو اس وقت وہ لوگ لوہا گرم کر کے بیمار کے جسم سے لگاتے تھے۔ تیسری صفت یہ کہ وہ بدشگونی نہیں لیتے کہ فلاں بات ہوگئی تو اس سے بُرا شگون لے لیا۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ ان باتوں کے بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ چار صفتیں ہوں گی وہ ان ستر ہزار افراد میں داخل ہوں گے جو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔

ستّر ہزار کا عدد کیوں؟

اور یہ جو ستر ہزار افراد بلا حساب وکتاب جنت میں داخل ہوں گے، ان کے لیے جو عدد بیان کیا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار ہوں گے، بعض حضرات نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ واقعۃً وہ ستر ہزار ہوں گے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ ستر ہزار افراد کا لفظ یہاں عدد بیان کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ کثرت کو بیان کرنا مقصود ہے، جیسے کوئی شخص کسی چیز کی کثرت کو بیان کرتا ہے تو اس کے لیے عدد بیان کر دیتا ہے، جب کہ مقصود عدد بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کثرت بیان کرنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی اس عدد سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس امت کے بے شمار افراد کو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمائیں گے اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ جو ستر ہزار افراد ہوں گے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار افراد ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو جنت میں داخل فرما دے۔ آمین۔

ستر ہزار میں شامل ہونے کی دعا

جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایک صحابی حضرت عُکاشہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے عرض کیا کہ

"یَا رَسُوْلَ اللهِ! فَادْعُ اللهَ اَنْ یَّجْعَلَنِیْ مِنْهُمْ"

یارسول اللہ! میرے لیے آپ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں داخل فرمادیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت ان کے لیے دعا فرمادی کہ یا اللہ! اِن کو اُن لوگوں میں داخل فرما دے جو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ بس ان کا تو پہلے مرحلے پر ہی کام بن گیا۔ جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ یہ تو بڑا اچھا موقع ہے، تو ایک صاحب اور کھڑے ہوگئے اور کہا یا رسول اللہ! میرے لیے دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں داخل فرمادیں، اس پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ"

یعنی عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔ مطلب یہ تھا کہ چونکہ سب سے پہلے انہوں نے دعا کی درخواست کردی، میں نے اس کی تعمیل کردی، اب یہ سلسلہ مزید دراز نہیں ہوگا، اب اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اس کو داخل فرمادیں گے۔

ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہیے

اس حدیث میں امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے بشارت ہے اور ان لوگوں کے لیے بڑی بشارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس جماعت میں داخل فرمالیں جو

بلا حساب وکتاب جنت میں داخل کردی جائے گی۔ ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں شامل فرمالیں، لیکن ان کی رحمت کے پیشِ نظر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی یہ دعا مانگ سکتا ہے کہ یا اللہ! میں اس قابل تو نہیں ہوں، لیکن آپ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ میرے جیسے آدمی کو بھی بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔ آپ کی رحمت کی وسعت میں کوئی کمی نہیں آتی، لہٰذا ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔

تکلیف یقینی اور فائدہ غیر یقینی والا علاج

بہرحال! اس حدیث میں چار صفات بیان فرمائی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات پائی جائیں گی، وہ جنت میں بلا حساب داخل ہوں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ علاج کے وقت داغ نہیں لگاتے۔ اس زمانے میں اہلِ عرب کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ لوگ جب کسی بیماری کا علاج کرتے اور کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تو ان کے یہاں یہ بات مشہور تھی کہ لوہا آگ پر گرم کرکے اس بیمار کے جسم پر لگایا جائے، اس کے ذریعے مریض کو سخت تکلیف ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ جب جلتا ہوا لوہا جسم سے لگے گا تو کیا قیامت ڈھائے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ علاج ہے اور اس سے بیماری دور ہوتی ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ علاج کو پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس طریقۂ علاج میں تکلیف نقد ہے اور فائدہ یقینی نہیں اور وہ علاج جس میں تکلیف تو نقد ہوجائے اور فائدہ کا پتہ نہ ہو کہ فائدہ ہوگا یا نہیں، ایسا علاج پسندیدہ نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔

علاج میں بھی اعتدال مطلوب ہے

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ درحقیقت یہ داغنے کا طریقہ علاج کے اندر غلو اور مبالغہ ہے، عرب میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ ''آخِرُ الدَّوَاءِ الْکَیُّ'' یعنی آخری علاج داغ لگانا ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ جب آدمی بیمار ہو جائے تو اس کا علاج کرانا سنت ہے، لیکن علاج ایسا ہونا چاہیے جو اعتدال کے ساتھ ہو، یہ نہیں کہ علاج کے اندر آپ انتہا کو پہنچ جائیں اور مبالغے سے کام لیں، یہ بات پسندیدہ نہیں۔ یہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کی کمی ہے، جس کی وجہ سے آدمی مبالغہ کر رہا ہے، انسان اسباب ضرور اختیار کرے، لیکن اعتدال کے ساتھ کرے۔ حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ''(۱)

یعنی ایک اجمالی کوشش کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، یہ ہے سنت، لہٰذا علاج میں اس طرح کا انہماک اور بہت زیادہ غلو پسندیدہ نہیں۔

بدشگونی اور بدفالی کوئی چیز نہیں

دوسری صفت جو بیان فرمائی وہ بدشگونی ہے، اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے کہ بدشگونی لینا کہ فلاں عمل سے یہ بدفالی ہوگئی، مثلاً بلی راستہ کاٹ گئی تو اب سفر

---

(۱) سنن ابن ماجہ ۵۱۳/۳ (۲۱۴٤) وصحیح ابن حبان ۳۲/۸ (۳۲۳۹) وقال البوصیری فی "مصباح الزجۃ" ۸/۳: ھذا اسناد ضعیف... لکن لم ینفرد ابن ماجہ باخراجہ من ہذا الوجہ، فقد رواہ ابن حبان فی صحیحہ .... ولہ شاہد من حدیث حذیفۃ رواہ البزار فی مسندہ۔

ملتوی کردیں، وغیرہ۔ یہ سب باتیں جاہلیت کے زمانے کی باتیں تھیں اور اس کا اصل سبب اللہ تعالیٰ پر بھروسے کی کمی تھی، اس وجہ سے فرمایا کہ وہ لوگ بدشگونی نہیں کرتے۔

تعویذ گنڈوں میں افراط وتفریط

تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ جھاڑ پھونک نہیں کرتے، یعنی وہ لوگ جو جنت میں بلا سبب داخل ہوں گے وہ جھاڑ پھونک کے ذریعے علاج نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان افراط وتفریط پائی جارہی ہے، بعض لوگ وہ ہیں جو سرے سے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بالکل ہی قائل نہیں، بلکہ وہ لوگ اس قسم کے تمام کاموں کو ناجائز سمجھتے ہیں اور بعض لوگ تو اس کام کو شرک قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگ ان تعویذ گنڈوں کے اتنے معتقد اور اس میں اتنے زیادہ منہمک ہیں کہ ان کے ہر کام کے لیے ایک تعویذ ہونا چاہیے، ایک وظیفہ ہونا چاہیے، ایک گنڈا ہونا چاہیے۔ میرے پاس روزانہ بے شمار لوگوں کے فون آتے ہیں کہ صاحب بچی کے رشتے نہیں آرہے ہیں، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں، میرا قرضہ ادا نہیں ہورہا ہے، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں، دن رات لوگ بس اس فکر میں رہتے ہیں کہ سارا کام ان وظیفوں سے اور ان تعویذ گنڈوں سے ہوجائے، ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

جھاڑ پھونک میں غیر اللہ سے مدد

یہ دونوں باتیں افراط وتفریط کے اندر داخل ہیں اور شریعت نے جو راستہ بتایا ہے وہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، جو قرآن وسنت سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ جھاڑ پھونک کی کوئی حیثیت نہیں اور تعویذ کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اگر چہ اس روایت میں ان لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے، لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ اس سے ہر قسم کی جھاڑ پھونک مراد نہیں، بلکہ اس حدیث میں زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کا جو طریقہ تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عجیب وغریب قسم کے منتر لوگوں کو یاد ہوتے تھے اور یہ مشہور تھا کہ یہ منتر پڑھو تو اس سے فلاں بیماری سے افاقہ ہوجائے گا، فلاں منتر پڑھو تو اس سے فلاں کام ہوجائے گا، وغیرہ اور ان منتروں میں اکثر وبیشتر جنات اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی، کسی میں بتوں سے مدد مانگی جاتی تھی۔ بہرحال! ان منتروں میں ایک خرابی تو یہ تھی کہ ان میں غیر اللہ سے، بتوں سے اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی کہ تم ہمارا یہ کام کردو، اسی طرح ان منتروں میں مشرکانہ الفاظ ہوتے تھے۔

جھاڑ پھونک کے الفاظ کو مؤثر سمجھنا

دوسری خرابی یہ تھی کہ اہلِ عرب ان الفاظ کو بذات خود مؤثر مانتے تھے، یعنی ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ تاثیر دے گا تو ان میں تاثیر ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی تاثیر کے بغیر تاثیر نہیں ہوگی، بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان الفاظ میں بذاتِ خود تاثیر ہے اور جو شخص یہ الفاظ بولے گا اس کو شفا ہوجائے گی۔ یہ دو

خرابیاں تو تھیں ہی، اس کے علاوہ بسا اوقات وہ الفاظ ایسے ہوتے تھے کہ ان کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے، بالکل مہمل قسم کے الفاظ ہوتے تھے، جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے، وہ الفاظ بولے بھی جاتے تھے اور ان الفاظ کو تعویذ کے اندر لکھا بھی جاتا تھا۔ درحقیقت ان الفاظ میں بھی اللہ کے سوا شیاطین اور جنات سے مدد مانگی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب شرک کی باتیں تھیں، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاہلیت کے جھاڑ پھونک کے طریقے کو منع فرمادیا اور یہ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں میں مبتلا نہیں ہوتے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ بلا حساب وکتاب جنت میں داخل فرمائیں گے، لہٰذا اس حدیث میں جس جھاڑ پھونک کا ذکر ہے اس سے وہ جھاڑ پھونک مراد ہے جس کا زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا۔

ہر مخلوق کی خاصیت اور طاقت مختلف

اس کی تھوڑی سی حقیقت بھی سمجھ لیجیے کہ یہ کارخانۂ حیات اور یہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں میں مختلف خاصیتیں اور مختلف تاثیریں رکھ دی ہیں، مثلاً پانی کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ پیاس بجھاتا ہے، آگ کے اندر جلانے کی خاصیت رکھ دی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ تاثیر آگ سے نکال دیں تو آگ جلانا چھوڑ دے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اسی آگ کو اللہ تعالیٰ نے گلزار بنادیا تھا۔ ہوا کے اندر تاثیر الگ رکھی ہے، مٹی کی تاثیر الگ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی مخلوقات پیدا فرمادی ہیں، انسان، جنات، جانور، شیاطین، وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک کو کچھ طاقت

دے رکھی ہے، انسان کو طاقت دے رکھی ہے، گدھے گھوڑے کو بھی طاقت دے رکھی ہے، شیر اور ہاتھی کو بھی طاقت دے رکھی ہے اور ہر ایک کی طاقت کا معیار اور پیمانہ مختلف ہے، شیر جتنا طاقتور ہے، انسان اتنا طاقتور نہیں ہے، سانپ کے اندر زہر رکھ دیا، اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ مرجائے، اسی طرح بچھو کے اندر زہر رکھ دیا ہے، لیکن اس کے کاٹنے سے مرتا نہیں، بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہرحال! ہر کسی کی خاصیتیں مختلف ہیں اور طاقتیں مختلف ہیں۔

جنات اور شیاطین کی طاقت

اسی طرح جنات اور شیاطین کو بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ طاقتیں دے رکھی ہیں، وہ طاقتیں انسان کے لیے باعثِ تعجب ہوتی ہیں، مثلاً جنات کو اور شیاطین کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں، یہ طاقت انسان کو حاصل نہیں، اگر انسان یہ چاہے کہ میں کسی کو نظر نہ آؤں، تو وہ ایسی صورت حاصل نہیں کرسکتا۔ اگر انسان یہ چاہے کہ میں ایک لمحہ میں یہاں سے اڑ کر امریکہ چلا جاؤں تو یہ طاقت اس کو حاصل نہیں ہے، لیکن بعض جنات اور شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دے رکھی ہے۔ یہ شیاطین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیرنے کے لیے بعض اوقات انسانوں کو ایسے کلمات کہنے کی ترغیب دیتے ہیں جو شرک والے ہیں، وہ شیاطین انسانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم وہ کلمات کہو گے جو شرک والے ہوتے ہیں اور نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور جو طاقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے، اس کو تمہارے حق میں استعمال کریں گے۔

اس عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں

مثلاً فرض کریں کہ کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے اور وہ بے چارہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے، اب اگر کسی جن یا شیطان کو پتہ چل گیا کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے تو وہ اس چیز کو اٹھا کر ایک منٹ میں لاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ طاقت دی ہے۔ اس شیطان نے اپنے معتقدین سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر تم یہ کلمات کہو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا اور وہ چیز لاکر دے دوں گا۔ اس کا نام ''جادو'' اس کا نام ''سحر'' اور ''کہانت'' ہے اور اسی کو ''سفلی'' عمل بھی کہا جاتا ہے، اس عمل کا تعلق نہ کسی نیکی سے ہے، نہ تقویٰ سے، نہ دین سے ہے اور نہ ہی ایمان سے، بلکہ بدترین کافر بھی اس طرح کے شعبدے دکھادیتے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے ہاتھ میں بعض جنات اور شیاطین مسخر ہیں، وہ جنات ان کا کام کردیتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت پہنچا ہوا آدمی ہے اور بڑا نیک آدمی ہے، حالانکہ اس عمل کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس عمل کے لیے ایمان بھی ضروری نہیں، اسی لیے سفلی عمل اور سحر کو حدیث شریف میں سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور سحر کرنے والے کی نوبت کفر تک پہنچتی ہے(۱)۔ بہرحال! یہ طریقہ جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا کہ اگر اللہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان ہے تو پھر یہ شرکیہ کلمات کہہ کر اور فضول مہمل کلمات ادا کرکے شیاطین کے ذریعے کام کرانا شریعت میں ناجائز اور حرام ہے اور کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔

---

(۱) وقد جاء فی الحدیث: "من سحر فقد اشرک" اخرجه النسائی ۱۱۲/۷ (٤٠٧٩) طبع المطبوعات الاسلامیة والمعجم الاوسط للطبرانی ۱۲۷/۲ (١٤٦٩) طبع دار الحرمین القاهره۔

بیمار پر پھونکنے کے مسنون الفاظ

لیکن ساتھ ہی رسول کریم ﷺ نے اس قسم کے منتروں اور شرکیہ کلمات کے بجائے خود اللہ جل شانہ کے نام مبارک سے جھاڑ پھونک کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ طریقہ سکھایا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص بیمار ہوجائے تو یہ کلمات کہو:

"اَللّٰھُمَّ اَذْھِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ اشْفِ وَاَنْتَ الشَّافِیْ لَاشِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُکَ، شِفَاءً لَا یُغَادِرُسَقَمًا"(۱)

اور بعض اوقات آپ نے کلمات سکھا کر فرمایا کہ ان کلمات کو پڑھ کر تھوکو اور اس کے ذریعے جھاڑو، آپ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین بھی فرمائی۔

معوذتین کے ذریعے دم کرنے کا معمول

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ کا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے "معوذتین" پڑھتے (۲) اور بعض روایات میں "قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" کا بھی اضافہ ہے(۳) یعنی "قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ"

---

(۱) صحیح البخاری ۱۳۲/۷ (۵۷۴۲) وصحیح مسلم ۱۷۲۱/۴ (۲۱۹۱)۔

(۲) صحیح البخاری ۱۹۰/۶ (۵۰۱۷)۔

(۳) رواہ البزار کما فی "کشف الاستار" ۲۷/۴ (۳۱۱۳) من حدیث خباب، قال الہیثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۲۱/۱۰ (۱۷۰۳٤): رواہ البزار، وفیہ جابر الجعفی، وھو ضعیف۔ ورواہ الطبرانی کما فی "جامع المسانید لابن کثیر" ۵۰۵/٤ (۵٦٦۸)-طبع دار خضر- من حدیث عباد بن اخضر او احمر۔ قال الہیثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۲۱/۱۰ (۱۷۰۳۲):

اور "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" ان تینوں سورتوں کو تین تین مرتبہ پڑھتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مارتے اور پھر پورے جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ یہ جھاڑ پھونک خود حضورِ اقدس ﷺ نے فرمائی اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کے ذریعے شیطانی اثرات سے، سحر سے اور فضول حملوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

مرضِ وفات میں اس معمول پر عمل

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسولِ کریم ﷺ مرضِ وفات میں تھے اور صاحبِ فراش تھے اور اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ اپنا دستِ مبارک پوری طرح اٹھانے پر قادر نہیں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے خیال آیا کہ رات کا وقت ہے اور سرکارِ دوعالم ﷺ ساری عمر یہ عمل فرماتے رہے کہ "معوذتین" پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم فرماتے تھے اور پھر ان ہاتھوں کو سارے جسم پر پھیرتے تھے، لیکن آج آپ ﷺ کے اندر یہ طاقت نہیں کہ یہ عمل فرمائیں، چنانچہ میں نے خود "معوذتین" پڑھ کر رسول کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر دم کیا اور آپ ہی کے دستِ مبارک کو آپ کے جسمِ مبارک پر پھیر دیا، اس لیے کہ اگر میں اپنے ہاتھوں کو آپ کے جسمِ مبارک پر پھیرتی تو اس کی اتنی تاثیر اور اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا فائدہ خود آپ کے دستِ مبارک پھیرنے سے ہوتا ہے۔[1] اور بھی متعدد مواقع پر رسولِ کریم ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ اگر

= وفيه يحيى الحماني، وجابر الجعفي، وكلاهما ضعيف۔ قال الجامع: وفي الباب عن فروة بن نوفل، عن ابيه، عند ابن حبان في "صحيحه" ٧٠/٣ (٧٩٠) وعن جبلة بن حارثة عند الطبراني كما في "مجمع الزوائد" ١٢١/١٠ (١٧٠٣٣) ورجاله وثقوا۔ عناية.

(١) صحيح مسلم ١٧٢٣/٤ (٢١٩٢)۔

جھاڑ پھونک کرنی ہے تو اللہ کے کلام سے کرو، اللہ کے نام سے کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نام میں یقیناً جو تاثیر ہے وہ شیاطین کے شرکیہ کلام میں کہاں ہوسکتی ہے، لہٰذا آپ نے اس کی اجازت عطا فرمائی۔

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

روایات میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک قافلہ کہیں سفر پر جارہا تھا، راستے میں ان کا زادِ راہ، یعنی کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا، راستے میں غیر مسلموں کی ایک بستی پر اس قافلے کا گزر ہوا، انہوں نے جاکر بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، اگر تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہو تو ہمیں دے دیں۔ ان لوگوں نے شاید مسلمانوں سے تعصب اور مذہبی دشمنی کے بنیاد پر کھانا دینے سے انکار کردیا کہ ہم تمہاری مہمانی نہیں کرسکتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے نے بستی کے باہر پڑاؤ ڈال دیا، رات کا وقت تھا، انہوں نے سوچا کہ رات یہاں پر گزار کر صبح کسی اور جگہ پر کھانا تلاش کریں گے۔

سردار کو سانپ نے ڈس لیا

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس بستی کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، اب بستی والوں نے سانپ کے ڈسنے کے جتنے علاج تھے، وہ سب آزمالیے، لیکن اس کا زہر نہیں اترتا تھا، کسی نے ان سے کہا کہ سانپ کا زہر اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کی جاتی ہے، اگر جھاڑ پھونک جاننے والا ہو تو اس کو بلایا جائے، تاکہ وہ آکر زہر اتارے۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں جھاڑ پھونک کرنے والا

کوئی نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ قافلہ جو بستی کے باہر ٹھہرا ہوا ہے، وہ مولوی قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان کے پاس جا کر معلوم کرو، شاید ان میں سے کوئی شخص سانپ کی جھاڑ جانتا ہو، چنانچہ بستی کے لوگ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا آپ میں کوئی شخص ہے جو سانپ کے ڈسے کو جھاڑ دے، بستی کے ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں جھاڑ دوں گا، لیکن تم لوگ بہت بخیل ہو کہ ایک مسافر قافلہ آیا ہوا ہے، تم سے کہا کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دو، تم نے ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بستی والوں نے کہا کہ ہم بکریوں کا پورا گلہ آپ کو دے دیں گے، لیکن ہمارے آدمی کا تم علاج کر دو۔

سورۂ فاتحہ سے سانپ کا زہر اتر گیا

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ مجھے جھاڑ پھونک تو کچھ نہیں آتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یقیناً برکت ہوگی، اس لیے میں ان لوگوں کے ساتھ بستی میں گیا اور وہاں جا کر ''سورۂ فاتحہ'' پڑھ کر دم کرتا رہا، سورۂ فاتحہ پڑھتا اور دم کرتا، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا زہر اتر گیا، اب وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور بکریوں کا ایک گلہ ہمیں دے دیا، ہم نے بکریوں کا گلہ ان سے لے تو لیا، لیکن بعد میں خیال آیا کہ ہمارے لیے ایسا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بکریاں ہمارے لیے حلال بھی ہیں یا نہیں؟ جب تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لیں، اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے۔

جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ سنایا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس طرح بکریوں کا گلہ ہمیں حاصل ہوا ہے، ہم اس کو رکھیں یا نہ رکھیں؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کو رکھنا جائز ہے، لیکن یہ بتاؤ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ سانپ کے کاٹنے کا یہ علاج ہے؟ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں نے سوچا کہ بے ہودہ قسم کے کلام میں تاثیر ہو سکتی ہے تو اللہ کے کلام میں تو بطریقِ اولیٰ تاثیر ہوگی، اس وجہ سے میں سورۂ فاتحہ پڑھتا رہا اور دم کرتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فائدہ پہنچا دیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے اس عمل سے خوش ہوئے اور ان کی تائید فرمائی اور بکریوں کا گلہ رکھنے کی بھی اجازت عطا فرمائی[1]۔

اب دیکھیے، اس واقعے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی نہ صرف تائید فرمائی، بلکہ اس عمل کے نتیجے میں بکریوں کا جو گلہ بطورِ انعام ملا تھا، اس کو رکھنے کی اجازت عطا فرمائی، اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں کہ رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی یہ عمل فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی کرایا یہ تو جھاڑ پھونک کا قضیہ ہوا۔

تعویذ کے مسنون کلمات

اب تعویذ کی طرف آیئے، تعویذ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں اور ان کو کبھی پیا

(۱) صحیح البخاری ۹۲/۱ (۲۲۷٦) و ۱۳۳/۷ (۵۷٤۹) وصحیح مسلم ۱۷۲۷/٤ (۲۲۰۱)۔

جاتا ہے اور کبھی گلے اور بازو میں باندھا جاتا ہے، کبھی جسم کے کسی اور حصے پر استعمال کیا جاتا ہے، خوب سمجھ لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کوئی تعویذ لکھا ہو، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعویذ لکھنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ کلمات سکھائے تھے کہ

«اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ»(۱)

چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے اور یہودی ان کے دشمن تھے اور ان کے خلاف جادو وغیرہ کرتے رہتے تھے، تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ کلمات سکھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم یہ کلمات خود پڑھا کرو اور اپنے اوپر اس کا دم کرلیا کرو، پھر ان شاء اللہ کوئی جادو تم پر اثر نہیں کرے گا، چنانچہ وہ یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔

ان کلمات کے فائدے

اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر رات کو سوتے ہوئے کسی کی آنکھ گھبراہٹ سے کھل جائے اور اس کو خوف محسوس ہو تو اُس وقت یہ کلمات پڑھ لے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بڑی اولاد کو تو یہ کلمات سکھا دیے ہیں اور یاد کرادیے ہیں، تاکہ اس کو پڑھ کر وہ اپنے اوپر دم کرتے رہا کریں اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہیں

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۲۰۸۱/٤ (۲۷۰۹) ومسند احمد ۲۹۵/۱۱ (٦٦۹٦) وسنن ابی داود ۱۲/٤ (۳۸۹۳) والمستدرک للحاکم ۷۳۳/۱ (۲۰۱۰) طبع دار الکتب العلمیة۔

اور جو میرے چھوٹے بچے ہیں وہ یہ کلمات خود سے نہیں پڑھ سکتے، ان کے لیے میں نے یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ہے اور ثابت ہے[1] اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اگر کسی عورت کی ولادت کا وقت ہو تو ولادت میں سہولت پیدا کرنے کے لیے تشتری یا صاف برتن میں یہ کلمات لکھ کر اس کو دھوکر اس خاتون کو پلا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے ولادت میں سہولت فرمادیتے ہیں[2]، اسی طرح بہت سے صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ لکھ کر لوگوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔

اصل سنّت ''جھاڑ پھونک'' کا عمل ہے

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہیے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور احادیث سے یقینا وہی بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ تعویذ کا فائدہ ثانوی درجے کا ہے، اصل فائدے کی چیز ''جھاڑ پھونک'' ہے، جو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، یہ عمل آپ نے خود فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی تلقین فرمائی، اس عمل میں زیادہ تاثیر اور زیادہ برکت ہے اور ''تعویذ'' اس جگہ استعمال کیا جائے جہاں آدمی وہ کلمات خود نہ پڑھ سکتا ہو اور نہ دوسرا شخص پڑھ کر دم کرسکتا ہو، اس موقع پر تعویذ دے دیا

---

(۱) سنن ابی داود ۱۲/٤ (۳۸۹۳) وسنن الترمذی ۵۰۰/۵ (۳۵۲۸۹) قال الترمذی هذا حديث حسن غریب۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلے میں مختلف کلمات منقول ہیں ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبۃ ۳۹/۵ (۲۳۵۰۸) وعمل اليوم والليلة لابن السنی ص ۵۷٦ (٦١٩) طبع دار القبلہ بیروت- والدعوات الكبير للبيهقی ۱۹۸/۲ (۵٦۵) طبع غراس کویت۔ از مرتب عفی عنہ

جائے، ورنہ اصل تاثیر ''جھاڑ پھونک'' میں ہے۔ بہر حال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دونوں طریقے ثابت ہیں۔

کون سے ''تمائم'' شرک ہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعویذ لٹکانا شرک ہے اور گناہ ہے، اس کی وجہ ایک حدیث ہے جس کا مطلب لوگ صحیح نہیں سمجھتے، اس کے نتیجے میں وہ تعویذ لٹکانے کو ناجائز سمجھتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اِنَّ الرُّقٰی وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَۃَ شِرْکٌ''(۱)

''تمائم'' تمیمۃ کی جمع ہے اور عربی زبان میں ''تمیمۃ'' کے جو معنی ہیں اردو میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے غلطی سے اس کے معنی ''تعویذ'' سے کر دیے، اس کے نتیجے میں اس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ ''تعویذ شرک ہے'' اب لوگوں نے اس بات کو پکڑ لیا کہ ہر قسم کا تعویذ شرک ہے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ''تمیمۃ'' عربی زبان میں سیپ کی ان کوڑیوں کو کہا جاتا ہے جن کو زمانہ جاہلیت میں لوگ دھاگے میں پرو کے بچوں کے گلوں میں ڈال دیا کرتے تھے اور ان کوڑیوں پر مشرکانہ منتر پڑھے جاتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ان کوڑیوں کو بذاتِ خود مؤثر سمجھا جاتا تھا، یہ ایک مشرکانہ عمل تھا، جس کو ''تمیمۃ'' کہا جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی کہ تمائم شرک ہے۔

---

(۱) سنن ابی داود ۹/٤ (۳۸۸۳) وسنن ابن ماجہ ۱۷۳/۵ (۳۵۳۰)۔

جھاڑ پھونک کے لیے چند شرائط

لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعے جھاڑ پھونک کا تعلق ہے، وہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور آپ کے صحابہ سے ثابت ہے، اس لیے وہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے جواز کے لیے چند شرائط انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر یہ عمل جائز نہیں۔

پہلی شرط

پہلی شرط یہ ہے کہ جو کلمات پڑھے جائیں ان میں کوئی کلمہ ایسا نہ ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگی گئی ہو، اس لیے کہ بعض اوقات ان میں ''یا فلاں'' کے الفاظ ہوتے ہیں اور اس جگہ پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام ہوتا ہے، ایسا تعویذ، ایسا گنڈا، ایسی جھاڑ پھونک حرام ہے، جس میں غیر اللہ سے مدد لی گئی ہو۔

دوسری شرط

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر جھاڑ پھونک کے الفاظ یا تعویذ میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ہی معلوم نہیں کہ کیا معنی ہیں، ایسا تعویذ استعمال کرنا بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی مشرکانہ کلمہ ہو اور اس میں غیر اللہ سے مدد مانگی گئی ہو یا اس میں شیطان سے خطاب ہو، اس لیے ایسے تعویذ بالکل ممنوع اور ناجائز ہیں۔

یہ رُقیہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے

البتہ ایک ''رقیہ'' ایسا ہے جس کے معنی ہمیں معلوم نہیں، لیکن حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عرض کیا کہ ایک عمل ایسا ہے کہ اگر سانپ یا بچھو کسی کو کاٹ لے تو اس کے کاٹے کا اثر زائل کرنے کے لیے اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں کہ

''شَجَّةٌ قَرْنِيَّةٌ مِلْحَةُ بَحْرٍ قَفَطًا''

اب اس کے معنی تو ہمیں معلوم نہیں، لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کیا گیا تو آپ نے اس کو منع نہیں فرمایا، شاید یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں اور یہ حدیث صحیح سند کی ہے[1]، اس لیے علماءِ کرام نے فرمایا کہ صرف یہ ایک ''رقیہ'' ایسا ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے کے باوجود اس کے ذریعے جھاڑ پھونک بھی

---

(۱) عمل الیوم واللیة لابن السنی ص ۵۲۲ (۵۷۳) والمعجم الاوسط ۲۶۶/۵ (۵۲۷۶) والمعجم الکبیر ۹۰/۱۰ (۱۰۰۵۰)۔ مذکورہ الفاظ عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے بارے میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں فرمایا رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ من لم اعرفہ۔ اور عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت کے بارے میں فرمایا رواہ الطبرانی فی الاوسط واسنادہ حسن۔ (ملاحظہ ہو مجمع الزوائد ۱۱۱/۵) طبع القدسی القاہرہ۔ صحیح مسلم ۱۷۲۶/۴ (۲۱۹۹) میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آل عمرو بن حزم کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے رقیہ سے منع کیا ہے ہمارے پاس ایک رقیہ (دم) ہے جس کے ذریعہ سے ہم سانپ کے ڈسنے کا علاج کرتے ہیں، انہوں نے وہ رقیہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پڑھا، آپ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔ مرتب۔

جائز ہے اور اس کے ذریعے تعویذ لکھنا بھی جائز ہے، البتہ اس پر ایسا بھروسہ کرنا کہ گویا ان ہی کلمات کے اندر بذاتِ خود تاثیر ہے، یہ حرام ہے، بلکہ ان کلمات کو ایک تدبیر سمجھے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

بہرحال! تعویذ اور جھاڑ پھونک کی یہ شرعی حقیقت ہے، لیکن اس معاملے میں افراط وتفریط ہورہی ہے، ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو اس عمل کو حرام اور ناجائز کہتے ہیں، ان کی تفصیل تو عرض کردی۔

تعویذ دینا عالم اور متقی ہونے کی دلیل نہیں

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بس سارا دین ان تعویذ گنڈوں کے اندر منحصر ہے اور جو شیخ تعویذ گنڈا کرتا ہے وہ بہت بڑا عالم ہے، وہ بہت بڑا نیک آدمی ہے، متقی اور پرہیز گار ہے، اسی کی تقلید کرنی چاہیے، اس کا معتقد ہونا چاہیے اور جو شخص تعویذ گنڈا نہیں کرتا یا جس کو تعویذ گنڈا کرنا نہیں آتا اس کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو دین کا علم ہی نہیں۔ بہت سے لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں کہ فلاں مقصد کے لیے تعویذ دے دیجیے، میں ان سے جب کہتا ہوں کہ مجھے تو تعویذ دینا نہیں آتا تو وہ لوگ بہت حیران ہوتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو اتنا بڑا دارالعلوم بنا ہوا ہے، اس میں تعویذ گنڈے سکھائے جاتے ہیں اور اس میں جو درس ہوتے ہیں وہ سب تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ہوتے ہیں، لہٰذا جس کو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا نہیں آتا، وہ یہاں پر اپنا وقت ضائع کررہے ہیں، اس لیے جو اصل کام یہاں پر سیکھنے کا تھا، وہ تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔

تعویذ گنڈے میں انہماک مناسب نہیں

ان لوگوں نے سارا دین تعویذ گنڈے میں سمجھ لیا ہے اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا کی کوئی غرض ایسی نہیں ہے جس کا علاج کوئی تعویذ نہ ہو، چنانچہ ان کو ہر کام کے لیے ایک تعویذ چاہیے، فلاں کام نہیں ہورہا ہے، اس کے لیے کیا وظیفہ پڑھوں؟ فلاں کام کے لیے ایک تعویذ دے دیں، لیکن ہمارے اکابر نے اعتدال کو ملحوظ رکھا کہ جس حد تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا، اس حد تک ان پر عمل کریں، یہ نہیں کہ دن رات آدمی یہی کام کرتا رہے اور دین و دنیا کا ہر کام تعویذ گنڈے کے ذریعے کرے، یہ بات غلط ہے، اگر یہ عمل درست ہوتا تو پھر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس کافروں پر کوئی ایسی جھاڑ پھونک کرتے کہ وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آکر ڈھیر ہوجاتے۔ آپ نے اس جھاڑ پھونک پر کبھی کبھی عمل بھی کیا ہے، لیکن اتنا غلو اور انہماک بھی نہیں کیا کہ ہر کام کے لیے تعویذ گنڈے کو استعمال فرماتے۔

ایک انوکھا تعویذ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آدمی آیا، اس کے دماغ میں یہی بسا ہوا تھا کہ مولوی اگر تعویذ گنڈا نہیں جانتا تو وہ بالکل جاہل ہے، اس کو کچھ نہیں آتا، چنانچہ آپ کو بڑا عالم سمجھ کر آپ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے تعویذ دے دو، مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو تعویذ آتا نہیں، اس نے کہا کہ اجی نہیں مجھے دے دو، حضرت نے فرمایا کہ مجھے آتا نہیں کیا دے دوں؟ لیکن وہ پیچھے پڑ گیا کہ مجھے تعویذ دے دو، حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا

کہ کیا لکھوں، تو میں نے اس تعویذ میں لکھ دیا کہ ''یا اللہ یہ مانتا نہیں، میں جانتا نہیں، آپ اپنے فضل وکرم سے اس کا کام کردیجیے'' یہ لکھ کر میں نے اس کو دے دیا کہ یہ لٹکا لے، اس نے لٹکا لیا اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعے اس کا کام بنا دیا۔

ٹیڑھی مانگ پر نرالا تعویذ

حضرت ہی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ جب میں سر کے بال بناتی ہوں تو مانگ ٹیڑھی بن جاتی ہے، سیدھی نہیں بنتی، اس کا کوئی تعویذ دے دو۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تعویذ آتا نہیں اور اس کا کیا تعویذ ہوگا کہ مانگ سیدھی نہیں نکلتی، مگر وہ عورت پیچھے پڑ گئی، حضرت فرماتے ہیں کہ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اھدنا الصراط المستقیم'' اس کا تعویذ بنا کر پہن لو تو شاید تمہاری مانگ سیدھی ہوجائے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھی کردی ہوگی۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کردیتے ہیں۔ بہرحال! بزرگوں کے واقعات اور حالات میں یہ جو لکھا ہوتا ہے کہ فلاں بزرگ نے یہ کلمہ لکھ دیا، اس سے فائدہ ہوگیا، وہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے سے کوئی درخواست کی گئی اور اس کے دل میں یہ آیا کہ یہ کلمات لکھ دوں، شاید اس سے فائدہ ہوجائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے فائدہ دے دیا۔

ہر کام تعویذ کے ذریعے کرانا

آج کل صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ہر وقت آدمی اسی جھاڑ پھونک کے دھندے میں لگا رہتا ہے، ہر وقت اسی تعویذ گنڈے کے چکر میں لگا رہتا ہے کہ صبح سے شام تک جو بھی کام ہو وہ تعویذ کے ذریعے ہو، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ملازمت کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، بیماری کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ہر چیز کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ہر چیز کی ایک الگ دعا ہونی چاہیے۔ تعویذ گنڈے میں اتنا انہماک اور غلوسنت کے خلاف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی جھاڑ پھونک کی ہے، لیکن یہ نہیں تھا کہ دنیا کے ہر کام کے لیے جھاڑ پھونک کررہے ہیں۔ کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہے ہیں، لڑائی ہورہی ہے، کہیں یہ منقول نہیں کہ کفار کو زیر کرنے کے لیے آپ نے کوئی جھاڑ پھونک کی ہو۔

تعویذ کرنا نہ عبادت، نہ اس پر ثواب

ہاں! دعا ضرور فرماتے تھے، اس لیے کہ سب سے بڑی اور اصل چیز دعا ہے، یاد رکھیے! تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعے علاج جائز ہے، مگر یہ عبادت نہیں، قرآنِ کریم کی آیات کو اور قرآنِ کریم کی سورتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کو اپنے کسی دنیوی مقصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ سے زیادہ جائز ہے، لیکن یہ کام عبادت نہیں اور اس میں ثواب نہیں ہے، جیسے آپ کو بخار آیا اور آپ نے دوا پی لی، تو یہ دوا پینا جائز ہے، لیکن دوا پینا عبادت نہیں، بلکہ ایک مباح کام ہے، اسی طرح تعویذ کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا، اس تعویذ اور جھاڑ پھونک میں

اگرچہ اللہ کا نام استعمال کیا، لیکن جب تم نے اس کو اپنے دنیاوی مقصد کے لیے استعمال کیا تو اب یہ بذاتِ خود ثواب اور عبادت نہیں۔

اصل چیز دعا کرنا ہے

لیکن اگر براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگو اور دو رکعت ''صلوۃ الحاجۃ'' پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! اپنی رحمت سے میرا یہ مقصد پورا فرما دیجیے، یا اللہ! میری مشکل حل فرما دیجیے یا اللہ! میری یہ پریشانی دور فرما دیجیے، تو اس دعا کرنے میں ثواب ہی ثواب ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت [1] یہ ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرو اور اگر دو رکعت ''صلوۃ الحاجۃ'' پڑھ کر دعا کرو تو زیادہ اچھا ہے، اس سے یہ ہوگا کہ جو مقصد ہے وہ اگر مفید ہے تو ان شاء اللہ حاصل ہوگا اور ثواب تو ہر حال میں ملے گا، اس لیے کہ دعا کرنا، چاہے دنیا کی غرض سے ہو وہ ثواب کا موجب ہے، اس لیے کہ دعا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَة ''[2]

دعا بذاتِ خود عبادت ہے۔

---

(۱) الزهد لابن المبارك ۳۸۳/۱ (۱۰۸٤) وسنن الترمذی ٤٨٩/١ (٤٧٩) قال الترمذی: ہذا حدیث غریب وفی اسناده مقال، والمستدرک للحاکم ٤٦٦/١ (١١٩٩)۔

(۲) سنن ابی داود ۷٦/۲ (۱٤۷۹) وسنن الترمذی ۸۰/٥ (۲۹٦۹) قال الترمذی: هذا حدیث حسن صحیح۔

تعویذ کرنے کو اپنا مشغلہ بنالینا

لہٰذا اگر کسی شخص کو ساری عمر جھاڑ پھونک کا طریقہ نہ آئے، تعویذ لکھنے کا طریقہ نہ آئے، لیکن وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یقیناً اس کا یہ عمل اس تعویذ اور جھاڑ پھونک سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے، لہٰذا ہر وقت تعویذ گنڈے میں لگے رہنا یہ عمل سنت کے مطابق نہیں۔ جو بات نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جس حد تک ثابت ہے اس کو اس حد پر رکھنا چاہیے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ہر وقت اس کے اندر انہماک اور غلو کرنا اور اس کو اپنا مشغلہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں، بس تعویذ گنڈوں کی یہ حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

روحانی علاج کیا ہے؟

اب لوگوں نے یہ تعویذ گنڈے، یہ عملیات، یہ وظیفے اور جھاڑ پھونک ان کا نام رکھ لیا ہے ''روحانی علاج''، حالانکہ یہ بڑے مغالطے اور دھوکے میں ڈالنے والا نام ہے، اس لیے کہ روحانی علاج تو دراصل انسان کے اخلاق کی اصلاح کا نام تھا، اس کے ظاہری اعمال کی اصلاح اور اس کے باطن کے اعمال کی اصلاح کا نام تھا۔ یہ اصل میں ''روحانی علاج'' تھا۔ مثلاً ایک شخص کے اندر تکبر ہے، اب یہ تکبر کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً حسد پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً بغض پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ حقیقت میں اس کا نام ''روحانی علاج'' ہے، لیکن آج اس تعویذ گنڈے کے علاج کا نام ''روحانی علاج'' رکھ دیا ہے، جو بڑے مغالطے والا عمل ہے۔

صرف تعویذ دینے سے پیر بن جانا

اور اگر کسی شخص کا تعویذ گنڈا اور جھاڑ پھونک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کامیاب ہوگیا تو یہ اس شخص کے متقی اور پرہیزگار ہونے کی دلیل نہیں اور نہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص دینی اعتبار سے مقتدیٰ بن گیا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں تاثیر رکھ دی ہے، جو شخص بھی اس کو پڑھے گا، تاثیر حاصل ہوجائے گی۔ یہ بات اس لیے بتادی کہ بعض اوقات لوگ یہ دیکھ کر کہ اس کے تعویذ بڑے کارگر ہوتے ہیں، اس کی جھاڑ پھونک بڑی کامیاب ہوتی ہے، اس کو "پیر صاحب" بنالیتے ہیں اور اس کو اپنا مقتدیٰ قرار دیتے ہیں، چاہے اس شخص کی زندگی شریعت کے احکام کے خلاف ہو، چاہے اس کی زندگی سنت کے مطابق نہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے بھی خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ایک عامل کا وحشت ناک واقعہ

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک وحشت ناک منظر دیکھا، وہ یہ کہ ایک مسجد میں جانا ہوا، معلوم ہوا کہ یہاں ایک عامل صاحب آئے ہوئے ہیں، نماز اور سنت وغیرہ پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ باہر لوگوں کی دو رویہ لمبی قطار لگی ہوئی ہے اور عامل صاحب مسجد سے باہر نکلے، تو لوگ قطار میں کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے منہ کھول دیے اور پھر پیر صاحب نے ایک ایک شخص کے منہ کے اندر تھوکنا شروع کردیا، پہلے دائیں طرف والے، پھر بائیں طرف والے کے منہ میں تھوکتے، اس طرح ہر شخص کے منہ میں اپنا بلغم اور تھوک ڈالتے جارہے تھے

اور پھر آخر میں کچھ لوگ بالٹیاں، ڈونگے اور جگ لیے کھڑے تھے اور ہر ایک اس انتظار میں تھا کہ پیر صاحب اس کے اندر تھوک دیں، تاکہ اس کی برکتیں اس کو حاصل ہوجائیں۔ یہ بات اس حد تک اس لیے پہنچی تھی کہ اس کے تعویذ گنڈے کارآمد ہوتے تھے۔

حاصلِ کلام

خدا کے لیے اس معاملے میں اپنے مزاج کے اندر اعتدال پیدا کریں، راستہ وہی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار فرمایا یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمایا اور یہ بات خوب اچھی طرح یاد رکھیں کہ اصل چیز براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور مانگنا ہے کہ یا اللہ! میرا یہ کام کردیجیے، اس سے بہتر کوئی تعویذ نہیں، اس سے بہتر کوئی کام نہیں اور یہ جھاڑ پھونک اور یہ تعویذ کوئی عبادت نہیں، بلکہ علاج کا ایک طریقہ ہے، اس پر کوئی اجروثواب مرتب نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی اجرت لینا، دینا بھی جائز ہے، اگر یہ عبادت ہوتی تو اس پر اجرت لینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ کسی عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں [1]، مثلاً کوئی شخص تلاوت کرے اور اس پر اجرت لے تو یہ حرام ہے، لیکن تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے۔ بہرحال! اگر واقعۃً ضرورت پیش آجائے تو حدود وقیود میں رہ کر اس کو استعمال کرسکتے ہیں، لیکن اس کی حدود وقیود سے آگے بڑھنا اور ہر وقت ان ہی تعویذ گنڈوں کی فکر میں رہنا۔ یہ کوئی سنت کا طریقہ نہیں اور حدیث شریف میں یہ جو فرمایا کہ

---

(۱) ردالمحتار ۵٦۲/۱ طبع دارالفکر بیروت۔

''وہ لوگ بلا حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے''۔

اس حدیث کے ایک معنی تو میں نے بتادیے کہ اس سے زمانہ جاہلیت میں کی جانے والی جھاڑ پھونک مراد ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس حدیث میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جو جائز جھاڑ پھونک ہے اس میں بھی غلو اور مبالغہ اور اس میں زیادہ انہماک بھی پسندیدہ نہیں، بلکہ آدمی اصل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھے اور جب ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، یہی بہترین علاج ہے، اس کے نتیجے میں یہ بشارت بھی حاصل ہوگی، جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس کا مصداق بنادے اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلا حساب داخلہ نصیب فرمادے۔آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ایمان خوف اور رجا کے درمیان ہے

(اصلاحی مجالس ج۶ ص ۲۷۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خوف اور رجا دونوں مطلوب ہیں

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امّا بعد!

گزشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں ''انفاسِ عیسیٰ'' کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ ''تعلق مع اللہ اور محبتِ خداوندی'' سے متعلق تھا، الحمد للہ! بقدرِ ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہورہا ہے، جس کا عنوان ہے ''خوف و رجا'' اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان ''خوف'' اور ''رجا'' کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لیے ضروری اور مطلوب ہے، ان میں ''خوف و رجا'' بھی ہیں، ''خوف'' کے معنی ہیں ''اللہ کا ڈر'' کیونکہ

اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو تو آدمی غفلت میں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ''رجا'' کے معنی ہیں ''امید'' یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے امید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے، بزرگوں نے متعدد احادیث کی بنیاد پر فرمایا کہ

''الایمان بین الخوف والرجاء ''(۱)

یعنی ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے، اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہوجائے تو ایمان کامل ہوجائے، جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہیے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اس طرح جتنی ''رجا'' ہونی چاہیے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہ ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۲) فرماتے ہیں کہ ''خوف اور رجا'' دو پَر ہیں، جن کے ذریعے صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعے پرواز کرتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

---

(۱) ملاحظہ ہو فتح الباری ۳۰۱/۱۱ باب الرجاء مع الخوف۔ وفیض الباری ٤٧٦/٤ وقد جاء فی الحدیث المرفوع: "ما اجتمع الرجاء والخوف فی قلب مومن الا اعطاہ اللہ الرجاء وامنہ من الخوف". (شعب الایمان للبیہقی ۳۱۷/۲ (۹۷۲) طبع الرشد)۔

(۲) احیاء علوم الدین ١٤٢/٤ کتاب الخوف والرجاء، طبع دار المعرفۃ.

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۱)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلو رات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی امید اور جہنم کا خوف

پورے قرآنِ کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آتا۔ یہ اس لیے کیا تاکہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے امید پیدا کریں اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں، چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿۵۰﴾ (۲)

---

(۱) سورۃ السجدۃ آیت (۱۶)۔

(۲) سورۃ الحجر آیت (۴۹-۵۰)۔

یعنی میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں،
بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں
اور ساتھ میں یہ بتادو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے۔

دیکھیے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید باندھے اور اس کے عذاب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہیے؟

اگر انسان پر تنہا ''خوف'' طاری ہوجائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف طاری ہوگیا اور ''امید'' بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہوجائے گی اور دوسرے ''یاس'' اور ''نا امیدی'' پیدا ہوجائے گی اور وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہ ''نا امیدی'' بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لیے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہوجائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھاجائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے اور دنیا کے کام بھی نہ کرسکے، اسی لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ»[1]

---

(۱) سنن الترمذی ٤٨١/٥ (٣٥٠٢) وقال: هذا حديث حسن غريب۔

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجیے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دے دے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہوجائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لیے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہوجاتا ہے اور خوف کا غلبہ ہوجاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ مَخَافَةً تَحۡجِزُنِیۡ عَنۡ مَعَاصِیۡكَ»[1]

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے۔

اس میں آپ ﷺ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ ''اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے''، اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لیے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہوجائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہوجائے۔

''خوف'' اور ''تقویٰ'' میں فرق ہے

یہاں یہ بات بھی واضح کردوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر ''تقویٰ'' کا لفظ بھی آیا ہے اور بعض جگہوں پر ''خوف'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ ''تقویٰ'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

---

(۱) المعجم الاوسط ۱۴/۳ (۲۳۱۸) وقال الھیثمی فی ''مجمع الزوائد'' ۲۸۲/۲ (۳۶۷۹) فیہ عبدالقدوس بن حبیب وھو متروک۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۱)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔ جب کہ ''خوف'' کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لیے کہ ''تقویٰ'' اور ''خوف'' میں فرق ہے، ''خوف'' کے معنی ہیں مطلق ڈر۔ جس سے آدمی مرعوب ہوجائے اور دل ودماغ پر اس کا ڈر مسلط ہوجائے، یہ ہے ''خوف'' جب کہ ''تقویٰ'' مطلق ''ڈر'' کا نام نہیں، بلکہ ''تقویٰ'' اس کیفیت کا نام ہے جو ''خوف'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہورہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام ''تقویٰ'' ہے، لہٰذا ''خوف'' نام ہے ڈر کا اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام ''تقویٰ'' ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہورہا ہے اس کا نام ہے ''خوف'' اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے، تم بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی یہ جو آیت ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۰۲)۔

وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (۱)

یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے، اور اس آیت کا ناسخ دوسری آیت ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۲)

یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا اور پھر یہ آیت نازل ہوئی ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو، لہٰذا اب ''حق تقته'' کا مطالبہ باقی نہیں رہا (۳)۔

دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام ڈر گئے کہ تقویٰ کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو اُن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ تقویٰ کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقوے کا بہت اونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ''حق تُقٰتِہٖ'' سے مراد ''ما استطعتم''

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۰۲)۔

(۲) سورۃ التغابن آیت (۱٦)۔

(۳) تفسیر الطبری ٥/٦٤٢ طبع دار ہجر و تفسیر عبد الرزاق ۱/٤٠٦ (٤٣٩) طبع دار الکتب العلمیة و القضاء و القدر للبیہقی ص ۲۳۱ (۲۹٤) طبع مکتبة العبیکان السعودیة۔

ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں کرتے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا''[1] لہٰذا یہ دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے[2]۔

''احیاء العلوم'' کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا ''خوف'' مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر ''مایوسی'' پیدا ہوجائے اور ''تقویٰ'' اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہیے، اس لیے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر ''خوف'' کا اتنا غلبہ ہوجائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہوگئے، ان کے ذہن الٹ گئے اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ تفصیل تو ''خوف'' کے بارے میں تھی۔

''امید'' میں حدِ اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز ''رجا'' ہے، جس کے معنی ہیں ''امید''۔ یہ ''امید'' بھی مطلوب ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ ''امید''

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۸٦).

(۲) تفسیر الطبری ٦٤١/٥ والناسخ والمنسوخ لابن سلام ص ۲٦۰ (٤٧٤) مکتبۃ الرشد۔

بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر ''امید'' اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام ''دھوکہ'' اور ''غرور'' ہے۔ ''امید'' اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اَلعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ''(1)

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جارہی ہیں، وہ جارہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں خواہش پیدا ہورہی ہے، اس کو پورا کررہا ہے، حلال حرام ایک کررہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہوگیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لیے کہ جب ''امید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے، لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہیے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہیے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''ناامیدی'' میں تبدیل نہ ہوجائے، دونوں کو اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہیے۔

دونوں کی حدِ اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ ''خوف'' اپنی حد کے اندر ہے اور یہ ''رجا'' اپنی

(1) الزهد لابن المبارك ۱/۵۵ (۱۷۱) وسنن الترمذي ۴/۲٤٦ (۲٤٥۹) وقال: هذا حديث حسن.

حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں ''خوف'' کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے اور ''رجا'' کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لیے ''فنِ تصوف'' ہے اور یہ پیری مریدی اس کام کے لیے ہے اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ وہ شیخ بتاتا ہے کہ ''خوف'' کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمد للہ تمہیں حاصل ہو چکا ہے اور جتنی ''رجا'' مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرمادی اور تم اعتدال کے اندر ہو اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کر کے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہے۔ آج کل لوگوں نے ''تصوف'' کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتادے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، شام کو یہ پڑھا کرو یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں۔ تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں، لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمالِ باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہوجائیں اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں ''خوف'' اور ''رجا'' دونوں کو بیان کیا ہے، تاکہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور ناامید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ناامیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہوجائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہوگی اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو''

(انفاسِ عیسیٰ: ۲۰۴)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ ''یاس'' ہے، اسی کا نام ''نا امیدی'' ہے، یہ مذموم ہے اور کسی مؤمن کے لیے یہ ''یاس'' جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہیے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسۡرَفُوا عَلٰىٓ أَنفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوا مِن رَّحۡمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (۱)

اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کرلیا ہو اور برے سے برا گناہ کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کرلیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کرلو گے اور یہ کہو گے ''استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ'' تو ان شاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کردیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں، لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہوسکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کیے گئے ہوں، جس کو

---

(۱) سورۃ الزمر آیت (۵۳)۔

اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ میں نے تمہارے لیے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ

''جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟''

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کر کے پریشان ہوں تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار کرو اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو۔ باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا، ارے جتنا وقت تم اس مراقبے میں گزار رہے ہو، وہ وقت ''اللہ کے ذکر'' میں اور ''سبحان اللہ'' پڑھنے میں گزارو اور توبہ کرو کہ یا اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کیے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، لہٰذا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یہ خیال کہ میں تو راندۂ درگاہ ہوں اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

ناامیدی کے غلبے کا نتیجہ

بعض اوقات غلبۂ حال کے نتیجے میں ''خوف'' کا یا ''یاس'' کا انسان پر غلبہ ہوجاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لیے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ

نہیں ہوتی اور دماغ میں یہی خیال سوار ہوجاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے، چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر ''قبض'' کی کیفیت طاری ہوئی، اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہوگیا کہ میں شیطان ہوں اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لیے اسے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہوگیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں، جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہوگیا ہوں اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہوگیا ہوں، اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ شیخ نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان بھی ان ہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کردی۔ بہر حال! علاج کے لیے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لیے کیا مفید ہوگا؟ اسی لیے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ ناامیدی ہے اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

ناامیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ ناامیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمارہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اکثر وبیشتر ہماری زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کررہے ہیں، یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہیے، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا

کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دے دی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل وکرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوادی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی گئی اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد ''الحمد للہ'' بھی کہو اور ''استغفر اللہ'' بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لیے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو ''مایوسی'' کی طرف لے جاتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، لہٰذا توفیق پر ''شکر'' اور کوتاہی پر ''استغفار'' کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، ان شاء اللہ پھر ''مایوسی'' پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
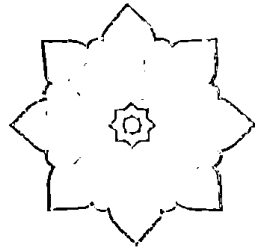
مخلوق کا ڈر
خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا

(اصلاحی مجالس ج ۶ ص ۲۸۹)
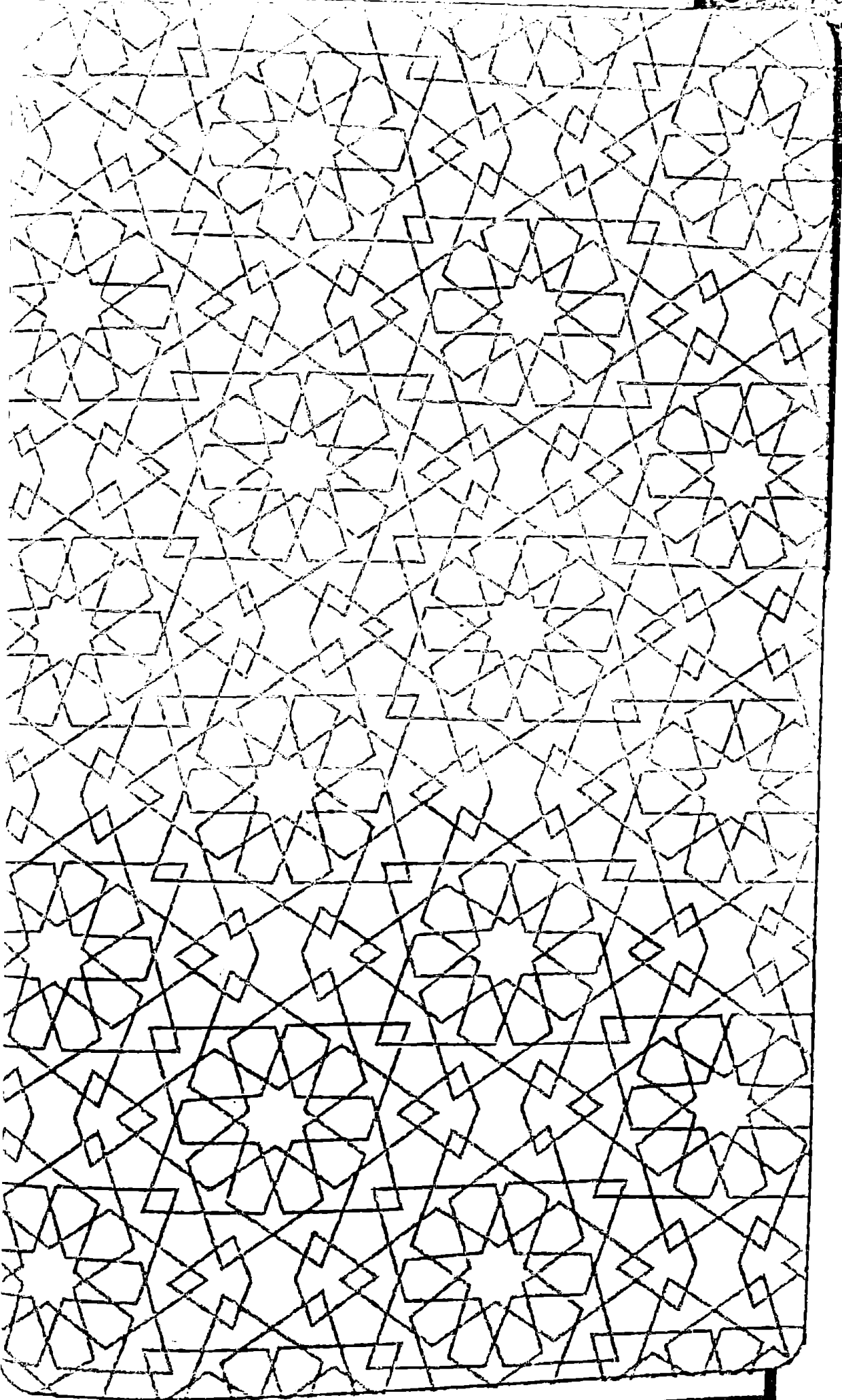
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا

الحمد للہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین والصّلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین، امّا بعد!

مخلوق سے زیادہ ڈرنا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھ کہ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہے"۔

یہ حالت اکثر و بیشتر پیش آتی ہے، شاید سب کو پیش آتی ہوگی، مثلاً کسی شخص سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اب اس شخص کو یہ ڈر ہے کہ اگر مخلوق میں کسی کو اس گناہِ عظیم کا علم ہوجائے گا تو بڑی بدنامی ہوگی، بڑی رسوائی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے کہ اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے، اب طبعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مخلوق کا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

مخلوق کا ڈر زیادہ ہونے کی مثال

مثلاً دنیا میں کسی انسان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ مجھے کوئی درندہ نہ کھالے، کوئی ظالم مجھے نقصان نہ پہنچادے یا پولیس کا خوف ہے، جیل میں جانے کا خوف ہے یا افسرِ بالا کا خوف ہے یا دشمن کا خوف ہے، اس قسم کا خوف جب انسان پر طاری ہوتا ہے تو ایک دم سے اس کے دل ودماغ پر چھاجاتا ہے، لیکن یہ خوف کہ اگر مجھ سے گناہ ہوگیا تو مجھے جہنم سے سابقہ پیش آئے گا یا اللہ جل جلالہ کی ناراضگی کا سامنا ہوگا، یہ خوف دل و دماغ پر چھاتا نہیں ہے۔ مثلاً اگر گھر کے اندر ڈاکو گھس جائیں اور گردن پر پستول رکھ کر کہیں کہ پیسے نکالو، تو اس ڈاکو سے جتنا ڈر لگے گا، گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس درجے کا یہ ڈر نہیں لگتا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے پیش ہوں گا، کہیں اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہ دے دیں، کہیں مجھے جہنم میں نہ ڈال دیں، اس بات کا ڈر اتنا نہیں ہوتا۔ بہر حال! ان صاحب نے حضرت والا کو یہ لکھا ہے کہ مجھے مخلوق کا خوف خالق کے خوف سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ حالت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں تو یہ حکم ہے:

وَاللّٰہُ اَحَقُّ ان تَخۡشٰہُ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ انسان اللہ سے زیادہ ڈرے اور مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے، واقعتًا ان صاحب نے بڑا اہم سوال کیا، اس لیے کہ مخلوق کا زیادہ ڈر کہیں ایمان کی کمزوری کی علامت تو نہیں ہے؟

---

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۳۷)۔

طبعاً مخلوق کا ڈر زیادہ ہونا مذموم نہیں

اب حضرت والا کا جواب سنئے! آپ نے جواب میں فرمایا کہ

''مخلوق کا ڈر خالق سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے اور عقلاً و اعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے، ''لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللّٰهِ ''(۱) کا بھی محمل ہے۔ اور طبعاً زیادہ ہونے کی لم تین امر ہیں: ایک یہ کہ مخلوق محسوس ہے اور حق تعالیٰ محسوس نہیں اور طبعاً حاضر کا اثر زیادہ ہوتا ہے غائب سے۔ دوسرے یہ کہ مخلوق سے تسامح کی توقع کم ہے اور خالق سے زیادہ ہے۔ تیسرے یہ کہ مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل ہونا گوارا۔''　　(انفاسِ عیسیٰ: ۲۰۴)

یعنی جو طبعی طور پر ایک آدمی کو مخلوق سے زیادہ ڈر محسوس ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کم محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کم اور زیادہ ہونا طبعی معاملہ ہے اور انسان کے اختیار سے باہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی گرفت نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خوف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ

چنانچہ حدیث شریف میں یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ ازواجِ مطہرات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے تکلفی کی باتیں کر رہی تھیں، اتنے میں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آرہے

---

(۱) سورۃ الحشر آیت (۱۳)۔

ہیں۔ اس وقت تک پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کی اطلاع سن کر تمام ازواجِ مطہرات وہ بے تکلفانہ انداز ختم کر کے ادب سے بیٹھ گئیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجلس میں آ گئے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے یہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں اور تمہارے آنے پر یہ ڈر گئیں اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواجِ مطہرات سے کہا کہ

اَی عَدُوَّاتِ اَنفُسِهِنَّ اَتَهَبنَنِی وَلَا تَهَبنَ رَسُولَ اللهِ (صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ)

یعنی اے جانوں پر ظلم کرنے والیو! تم مجھ سے ڈرتی ہو اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں ڈرتی ہو؟ ازواجِ مطہرات نے جواب دیا۔

"نَعَم اَنتَ اَفَظُّ وَاَغلَظُ مِن رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم"

جی ہاں! اس لیے کہ آپ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں سخت کلام اور سخت مزاج والے ہیں[1]۔

اب دیکھیے! ازواجِ مطہرات کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طبعی خوف زیادہ تھا، اس لیے کہ یہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔

شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرنا

ایک حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

(۱) صحیح البخاری ۱۲۶/۴ (۳۲۹۴) و ۱۱/۵ (۳۶۸۳) وانظر معه فتح الباری ۴۷/۴۔

فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزرتے ہیں، شیطان ڈر کے مارے اس راستے سے نہیں گزرتا[1]۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جس راستے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرتے ہیں، اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا اور خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ جس راستے سے آپ گزریں اس راستے پر شیطان نہیں گزرتا، کیا شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرتا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے نہیں ڈرتا؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ پہلے ظرافت کا جواب دیا کرتے تھے اور پھر تحقیقی جواب دیا کرتے تھے، اس لیے جب اس شخص نے سوال کیا تو پہلے آپ نے اس شخص سے فرمایا: پوچھو اس بیوقوف سے وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیوں نہیں ڈرتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیوں ڈرتا ہے؟

کسی سے زیادہ ڈر اس کی عظمت کی دلیل نہیں

پھر تحقیقی جواب دیا کہ دراصل یہ ڈر اور خوف طبعی کیفیت ہے اور اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا کسی شخص سے ڈر زیادہ ہونا اس کے عظیم ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عظمت دل میں زیادہ ہے یا اس کی محبت زیادہ ہے، بلکہ اس شخص کی ایک خاص طبیعت ہے، اس طبیعت کی وجہ سے آدمی کے دل میں رکاوٹ اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے جو پہلے شخص سے افضل اور عظیم ہے، لیکن اس کے دل میں نرمی ہے، جس کی وجہ سے لوگ اس سے بے

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱/۵ (۳۶۸۳) و صحیح مسلم ۱۸۶۳/۴ (۲۳۹۶)۔

تکلف ہوجاتے ہیں اور اس سے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی بار محسوس نہیں کرتے، اس وجہ سے ڈر محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا کسی سے ڈر کا زیادہ ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں۔ اگر شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ڈرتا ہے تو یہ ان کا طبعی معاملہ ہے اور اس بات کی دلیل نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل ہوگئے۔ اسی لیے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے۔''

عقلاً اللہ تعالیٰ کا ڈر زیادہ ہونا چاہیے

آگے فرمایا کہ ''اور عقلاً اور اعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے''، یعنی عقلاً اللہ کا ڈر مخلوق کے ڈر سے زیادہ ہونا چاہیے، طبعاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا کوئی ضروری نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی دل میں یہ سوچے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے یا اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ جب ان دونوں میں موازنہ کرے گا تو اس وقت ظاہر ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف ہوگی، لہٰذا عقلی طور پر اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر زیادہ کرنی چاہیے۔ جب یہ بات دل میں ہے تو بس ان شاء اللہ مقصود حاصل ہے۔ اس کے بعد طبعی طور پر خوف کی جو کیفیت ہوتی ہے، مثلاً ڈر جانا، سہم جانا، دہل جانا، فکر طاری ہوجانا، دماغ پر خوف کا مسلط ہوجانا، یہ سب غیر اختیاری کیفیات ہیں، لہٰذا اگر یہ غیر اختیاری کیفیات مخلوق سے زیادہ ہوگئی ہیں تو اس میں گھبرانے کی بات نہیں۔ کیسی عجیب بات حضرت والا

نے بیان فرمادی اور کتنا بڑا خلجان دور کر دیا، اس لیے کہ بعض اوقات جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ میں خالق کے مقابلے میں مخلوق سے زیادہ ڈرتا ہوں، تو دماغ میں یہ خیال آئے گا کہ میرا تو ایمان ہی جاتا رہا، حضرت والا نے اس خلجان اور خیال کو دور فرما دیا۔

مخلوق محسوس ہے، اللہ تعالیٰ محسوس نہیں

پھر جو بات ارشاد فرمائی کہ قرآنِ کریم کی آیت: لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنَ اللّٰهِ [۱] کا بھی یہی محمل ہے، یعنی مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا اعتقاداً مذموم ہے، طبعاً مذموم نہیں اور طبعاً مذموم نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ مخلوق محسوس ہے، اللہ تعالیٰ محسوس نہیں، یعنی مخلوق نظر آ رہی ہے، مثلاً ایک شخص پستول تانے کھڑا ہے تو وہ شخص بھی نظر آ رہا ہے اور پستول بھی نظر آ رہا ہے اور یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ اگر یہ پستول سے گولی چل گئی تو میں مر جاؤں گا۔ جب کہ اللہ جل شانہ بذاتِ خود محسوس نہیں، اللہ تعالیٰ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، نہ ہاتھوں سے چھوا جا سکتا ہے اور نہ جہنم کا عذاب نظر آ رہا ہے اور انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ اس چیز کا اثر زیادہ لیتا ہے جو چیز محسوس ہو رہی ہو، بنسبت اس چیز کے اثر کے جو محسوس نہ ہو، اگرچہ عقلاً اس کے وجود کو مانتا ہے، لیکن طبیعت پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا محسوس چیز کا ہوتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الحشر آیت (۱۳)۔

غائب کے مقابلے میں حاضر سے ڈر زیادہ ہوتا ہے

یا مثلاً کسی شخص کو اس بات کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ کل کو یہ واقعہ پیش آ جائے گا، لیکن ایک واقعہ ابھی آنکھوں کے سامنے پیش آ رہا ہے تو اس واقعے کا ڈر، خوف اور اس سے بچنے کی فکر اور اس کی گھبراہٹ زیادہ ہوگی، بنسبت اس واقعے کے خوف کے جو کل آنے والا ہے، اس لیے جو واقعہ ابھی پیش آ رہا ہے، وہ محسوس ہو رہا ہے اور جو واقعہ کل پیش آئے گا وہ محسوس نہیں ہے۔ یہ انسان کی طبعی بات ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر مخلوق کے خوف کی زیادتی کیوں ہے؟ اس لیے کہ ''طبعاً حاضر کا اثر زیادہ ہوتا ہے غائب سے'' جو شخص سامنے بیٹھا ہے اس کا جو اثر ہوگا وہ غائب کا نہیں ہوگا، چاہے غائب کی عظمت دل میں زیادہ ہو۔

مخلوق سے معافی کی امید کم ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ ''مخلوق سے تسامح کی توقع کم ہے اور خالق سے زیادہ ہے۔'' یہ بہت بڑی بات بیان فرما دی اس لیے کہ مخلوق بڑی خراب چیز ہے، یہ کسی کو نہیں بخشتی، اگر مخلوق کے سامنے یہ بات آ جائے کہ فلاں نے یہ گناہ کیا ہے، تو یہ مخلوق اس کو نہیں بخشے گی، بلکہ اس کو بدنام اور رسوا کرے گی، اس کو سزا دلوائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہے کہ بندہ گناہ بھی کر رہا ہے، لیکن ساتھ میں شرمندہ بھی ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میرا معاملہ میرے اللہ سے ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ شاید مجھے معاف فرما دیں۔ تو وہاں معافی کی توقع زیادہ ہے، بہ نسبت مخلوق کے، اس لیے بندوں کے سامنے گناہ ظاہر کرنے کے خیال سے انسان کو کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

جہنم میں جانا گوارا کر لے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے اور تم نے درخواست کی کہ یا اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہوئے ہیں، اپنی رحمت سے مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم تمہارے گناہ معاف تو کر دیں گے اور تمہیں جہنم کا عذاب نہیں دیں گے، لیکن ایک شرط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعمال نامہ کی ایک فلم لوگوں کے سامنے چلائیں گے اور اس فلم کو دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا، تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہوں گے، تمہارے بیوی بچے ہوں گے، تمہارے دوست احباب ہوں گے، تمہارے شاگرد ہوں گے، تمہارے مرید بھی ہوں گے اور فلم چلانے کے بعد ہم تمہیں معاف فرما دیں گے اور تمہیں جنت میں بھیج دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ معاف کرنے پر یہ شرط لگا دیں گے تو کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو کہے گا کہ یا اللہ! آپ مجھے تھوڑی دیر کے لیے جہنم میں بھیج دیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے میری فلم چلائیں، اس لیے کہ مخلوق کے سامنے رسوائی سے زیادہ خوف ہوتا ہے اور یہ خوف اس لیے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مخلوق بڑی سنگ دل ہے، اگر اس کے علم میں میری کوئی کمزوری آ گئی تو یہ مجھے نہیں بخشے گی اور اللہ جل جلالہ میرے خالق و مالک ہیں، اصل عظمت ان ہی کو حاصل ہے، لیکن ان کے بارے میں مجھے یہ امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرما دیں گے، ان سے کیا چھپانا، جو کچھ ہے سب ان کے سامنے ہے۔

مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے

تیسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل ہونا گوارا ہے، اس لیے کہ مخلوق کے سامنے کوئی گناہ آ گیا تو ذلت ہوگی، مخلوق یہ کہے گی کہ یہ بڑا بدعمل آدمی ہے، بڑا فاسق وفاجر آدمی ہے، بڑا گناہ گار ہے، بڑا مکار ہے، بڑا منافق ہے اور مخلوق کی نظر میں ذلت بڑی ناگوار بات ہے۔ دوسری طرف اگر اللہ جل شانہ کی نظر میں یہ بات آ جائے کہ بندہ بڑا فاسق و فاجر ہے، یہ بڑا گناہ گار اور خطا کار ہے، تو یہ بھی ذلت کی بات ہے، لیکن یہ ذلت مطلوب ہے، اس لیے بندہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں بڑا گناہ گار ہوں، بڑا خطا کار ہوں، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرما دیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہونا مطلوب ہے اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہونا ناگوار ہے اور شرعاً بھی ذلت مطلوب نہیں، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا"(۱)

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا۔

اس لیے کہ لوگوں کی نگاہ میں عزت مطلوب ہے، ذلت مطلوب نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلت عین مطلوب ہے، اسی لیے حضرت والا نے فرمایا کہ

---

(۱) مسند البزار ۳۱۵/۱۰ (٤٤٣٩) وقال: وبذا الحديث لا نعلم احدا رواه عن عبد الله بن بريدة عن ابيه الا عقبة الاصم، وهو رجل من ابل البصرة ليس به باس۔ وذكره الهيثمي في "مجمع الزوائد" ۱۸۱/۱۰ (۱۷٤۱۲) وقال: وفيه عقبة بن عبد الله الاصم، وبو ضعيف، وقد حسن البزار حديثه۔

مخلوق کا ڈر زیادہ ہوتا ہے خالق کے ڈر کے مقابلے میں، نہ یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے اور نہ گھبرانے کی بات ہے۔

شیخِ کامل ہی صحیح علاج بتا سکتا ہے

یہ باتیں شیخِ کامل ہی بتا سکتا ہے، ورنہ اگر کسی معمولی آدمی کے سامنے یہ بات کہی جائے کہ مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے خالق کے مقابلے میں، تو وہ جواب میں یہ کہے گا کہ تو کافر ہو گیا، یہاں سے بھاگ جا، تو اللہ سے نہیں ڈرتا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ[1]

لیکن جو شخص نفس کی باریکیوں سے واقف ہے اور جو یہ جانتا ہے کہ یہ انسان ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت کے اندر کیا کیا باتیں رکھی ہیں اور حقیقتِ حال کیا ہے؟ اس نے چند لفظوں میں یہ سارا ماجرا حل کر دیا اور سارا شک و شبہ دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، یہ ایک ایسا مقام ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی رہنمائی غلط ہو جائے تو آدمی کفر اور نفاق تک پہنچ جاتا ہے، مایوسی تک پہنچ جاتا ہے، اس کے اوپر یاس طاری ہو جاتا ہے اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، لیکن شیخِ کامل نے کانٹا بدل دیا کہ سارے شکوک و شبہات کافور ہو گئے اور جو حقیقتِ حال ہے وہ بیان کر دی۔

علاج کا ایک طریقہ "تصورِ شیخ"

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے علاج کا جو ایک طریقہ تجویز فرمایا ہے،

---

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۳۷)۔

اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کے لیے غلط فہمی کی وجہ سے اعتراض کا سبب بن گئیں، چنانچہ ''تصورِ شیخ'' کا لفظ آپ نے سنا ہوگا، یہ علاج کا ایک طریقہ تھا، جو مشائخ اپنے مریدین سے بطور علاج کرایا کرتے تھے اور مشائخ اپنے مریدین سے کہتے ہیں کہ جس وقت تم ذکر کرو تو ذکر کے وقت اپنے شیخ کا تصور کرو، اگر کسی گناہ کا تقاضا دل میں پیدا ہو رہا ہے تو اس وقت بھی اپنے شیخ کا تصور کرو۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ ذکر کے وقت تصورِ شیخ تو ''شرک'' ہے، اس لیے کہ ذکر تو اللہ کے لیے کیا جا رہا ہے، لہٰذا تصور بھی اللہ کا کرنا چاہیے نہ کہ شیخ کا تصور۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور تصورِ شیخ

یہاں تک نوبت آئی کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کو یہ تجویز کیا کہ آپ ''تصورِ شیخ'' کیا کریں۔ جواب میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت! اگر آپ مجھے کسی گناہ کے کرنے کا حکم دیتے تو میں اس خیال سے وہ گناہ کر لیتا کہ بعد میں توبہ کر لوں گا، لیکن اس عمل میں مجھے شرک کی بو آتی ہے، اس لیے یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چلو تم اس سے مستثنیٰ ہو[1]۔ اب دیکھیے! حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ کو اس کے اندر شرک کی بو آئی چونکہ ان کے اوپر توحید کا غلبہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے توحید پر استقامت عطا فرمائی تھی، اس وجہ سے انہوں نے یہ کہا۔

---

(۱) ارواح ثلاثہ یعنی حکایات اولیاء ص ۱۰۳ حکایت (۱۱۲) طبع دار الاشاعت کراچی۔

''تصورِ شیخ'' کا مقصد یکسوئی حاصل کرنا

لیکن بعض لوگوں نے ''تصورِ شیخ'' پر اعتراض کرتے ہوئے باقاعدہ یہ کہہ دیا کہ شرک ہے اور جو لوگ ''تصوف'' پر اعتراض کرنے والے ہیں، وہ ''تصورِ شیخ'' ہی کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ یہ ''تصوف'' شرک کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''تصورِ شیخ'' کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دماغ کو ذکر اللہ کے وقت یکسو کیا جائے، اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ''محسوس'' نہیں، کسی محسوس چیز کا تصور انسان کرے گا تو وہ تصور جم جائے گا، غیر محسوس چیز کا تصور نہیں جمے گا۔ مبتدی شخص جس کے دل ودماغ پر اللہ کا ذکر اور فکر چھایا نہیں ہے، اس کے لیے صوفیاء نے ایک محسوس تجویز کردی کہ اپنے شیخ کا تصور کیا کرو اور پھر جو حضرات اس تصور کو تجویز کرتے تھے، وہ صرف اس حد پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ تصورِ شیخ کے ذریعے جب ایک مرتبہ یکسوئی حاصل ہوگئی تو بعد میں اس یکسوئی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی جانب پھیر دیتے تھے اور پھر وہ ذاکر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوجاتا تھا۔

''تصورِ بھینس'' سے علاج

جیسے میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی اپنی اصلاح کرانے اور مرید ہونے کے لیے گیا، اس نے جاکر کہا کہ حضرت! مجھے مرید کرلو۔ ان بزرگ نے اس کو مرید کرلیا، اس کے بعد اس نے کہا کہ میں کیا کروں، میرا نہ ذکر میں دل لگتا ہے، نہ نماز میں دل لگتا ہے، میں تو

بس نماز میں اٹھک بیٹھک کرتا رہتا ہوں۔ ان بزرگ نے اس سے پوچھا کہ ساری دنیا میں تجھے کس چیز سے زیادہ محبت ہے؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ میری بھینس ہے، مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے، ان بزرگوں نے اس سے کہا کہ تو روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک گھنٹے تک بھینس کا تصور کیا کر۔ اس دیہاتی نے کہا کہ میں تو اللہ میاں کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جو کہہ رہا ہوں تو وہ کر۔ چنانچہ وہ کمرے میں بیٹھ گیا اور بھینس کا تصور کرنے لگا، چنانچہ چند دنوں کے بعد اس کے دل و دماغ پر بھینس مسلط ہوگئی کہ بھینس آرہی ہے، بھینس جارہی ہے، بھینس دودھ دے رہی ہے، بھینس چر رہی ہے، بھینس نہارہی ہے، یہاں تک نوبت آگئی کہ جب شیخ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو شیخ سے کہنے لگے کہ نہیں، ابھی یہاں نہ آنا، یہاں بھینس آرہی ہے، جب اس حد تک بھینس اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئی تو شیخ نے کہا کہ بس، اب کام بن گیا، چنانچہ بھینس کے تصور کے رخ کو اللہ کے تصور کی طرف پلٹ دیا۔ یہ سب اس لیے کیا کہ ابتداءً اللہ جل شانہ کی طرف دھیان لے جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ محسوس نہیں ہیں، اس لیے پہلے اس کے ذہن کو تمام خیالات سے فارغ کرکے یکسو کر دیا، تو اب اس کا رخ موڑنا آسان ہوگیا۔

یکسوئی کے بعد رُخ موڑ دو

یہ ''تصورِ شیخ'' بھی اس لیے کرایا جاتا ہے کہ تمام خیالات سے فارغ کرکے ذہن کو یکسو کر دیا جائے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے، لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ ''بھینس'' کا تصور بھی شرک ہے اور

''شیخ'' کا تصور بھی شرک ہے، حالانکہ ذہن کو فارغ کرنے اور اس کو یکسو کرنے کا ایک علاج تھا اور جب ذہن یکسو ہوگیا تو اس کا رخ موڑ دیا، اس کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرا دیا، بلکہ یہ ایک علاج ہے۔

بدنظری کا ایک علاج

چنانچہ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی دل میں بد نظری کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت یہ تصور کرلیا کرو کہ اگر اس وقت میرے استاذ میرے سامنے آجائیں یا میرے والدِ ماجد آجائیں یا میری اولاد آجائے اور وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لیں کہ میں غیر محرم کو دیکھ کر لذت لے رہا ہوں، تو اس وقت وہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ جب تم یہ سوچو گے تو ان شاء اللہ اس گناہ کو کرنے کا داعیہ کمزور ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا تصور کیوں نہ کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نے یہ تو فرمایا کہ اس گناہ کے وقت یہ سوچے کہ میرا استاذ دیکھ رہا ہے، میرا باپ دیکھ رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ یہ سوچے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ علم تو ہمیں حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کی ذات محسوس نہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تصور قائم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس لیے مبتدی کے لیے آسانی اس میں ہے کہ وہ کسی ایسی شخصیت کا تصور کرلے جو محسوس ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استاذ اور باپ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ عظمت والے ہیں اور ان حضرات کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کے مقابلے میں

زیادہ خطرناک ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ ان کے علم میں آنے سے، زیادہ بدنامی اور زیادہ رسوائی ہے اور یہ لوگ اس طرح سے معاف نہیں کر سکتے جس طرح سے اللہ تعالیٰ معاف کر سکتے ہیں۔

حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے درمیان مکالمہ

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کھانا کھا رہے تھے، اتنے میں حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچ گئے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دوست بھی تھے اور ان دونوں کے درمیان لطیفے بھی ہوا کرتے تھے، جب وہاں بیٹھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اُدْنُ فکُلْ"

آؤ کھانا کھالو۔

انہوں نے جواب دیا:

"قَدْ اَکَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْن"

"اے امیر المومنین! میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اِنَّ مِن شراھةِ المَرْءِ اَن لَّا یَدَعَ المَرْءُ فِیْ بَطْنِهٖ مُسْتَزَادًا لِلْمُسْتَزِیْدِ"

یہ بڑی طمع اور حرص کی بات ہے کہ آدمی جب کھانا کھائے تو اپنے پیٹ

میں اتنی گنجائش بھی نہ چھوڑے کہ دوسرا آدمی کھلانا چاہے تو اس کی فرمائش بھی قبول نہ کرے۔ اس طرح کھانا تو بری بات ہے، یہ بلیغ جملہ کہا۔

انہوں نے جواب دیا: چونکہ وہ حاضر جواب تو تھے۔

"قَدْ فَعَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ!"

امیر المومنین! میں نے ایسا ہی کیا ہے، یعنی میں نے یہ نہیں کیا کہ پورا پیٹ بھر لیا ہو اور جگہ نہ چھوڑی ہو، بلکہ پیٹ میں جگہ چھوڑی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

"اَلِمَنْ هُوَ اَوْجَبُ حَقًّا مِنْ أَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ"

یعنی یہ جو تم نے جگہ چھوڑی ہے کسی ایسے شخص کے لیے چھوڑی ہے جس کی فرمائش پوری کرنا امیر المومنین کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہو؟ یعنی جب میں نے تمہیں کھانے کے لیے بلایا تو تم نے انکار کر دیا، اب یہ جو جگہ تم نے چھوڑی ہے وہ کس کے لیے چھوڑی ہے؟ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو پھانس دیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"لَا، وَلٰكِنْ لِمَنْ لَا یَعْذُرُ عُذْرَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ"

یعنی میں نے یہ جگہ اس شخص کے لیے چھوڑی ہے جو امیر المؤمنین کی طرح معذرت قبول نہ کرے اور معاف نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ آپ تو معاف کر دیں گے، اور معذرت قبول کر لیں گے، لیکن بعض لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں جو

معذرت قبول نہیں کرتے، ان کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑی ہے، آپ کی وجہ سے نہیں چھوڑی ہے[1]۔

خلاصہ

بہر حال! آدمی بعض اوقات کسی دوسرے سے اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کو پتہ چل گیا تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا، معاف نہیں کرے گا، لیکن دوسرا شخص جو پہلے کے مقابلے میں کتنے ہی بڑے درجے کا کیوں نہ ہو، اس سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ اگر اس کو پتہ لگ گیا تو اس سے معافی مانگ لوں گا، اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑ لوں گا، تو وہ مجھے معاف کردے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے شخص کی عظمت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمارے دلوں میں اپنا خوف اور اپنی رجا دونوں پیدا فرما دے اور دونوں میں اعتدال بھی عطا فرما دے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعوَانَا اَنِ الحَمدُ للهِ رَبِّ العٰلَمِينَ

(۱) کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری ص ۱۸ طبع المکتبۃ العصریۃ بیروت۔ والتذکرۃ الحمدونیۃ ۸۷/۹ فقرہ (۱٤٦) طبع دار صادر بیروت۔
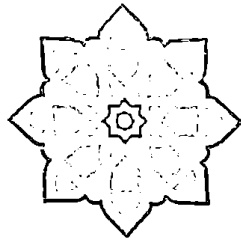
مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہیے

(اصلاحی مجالس ج ۲ ص ۲۹)
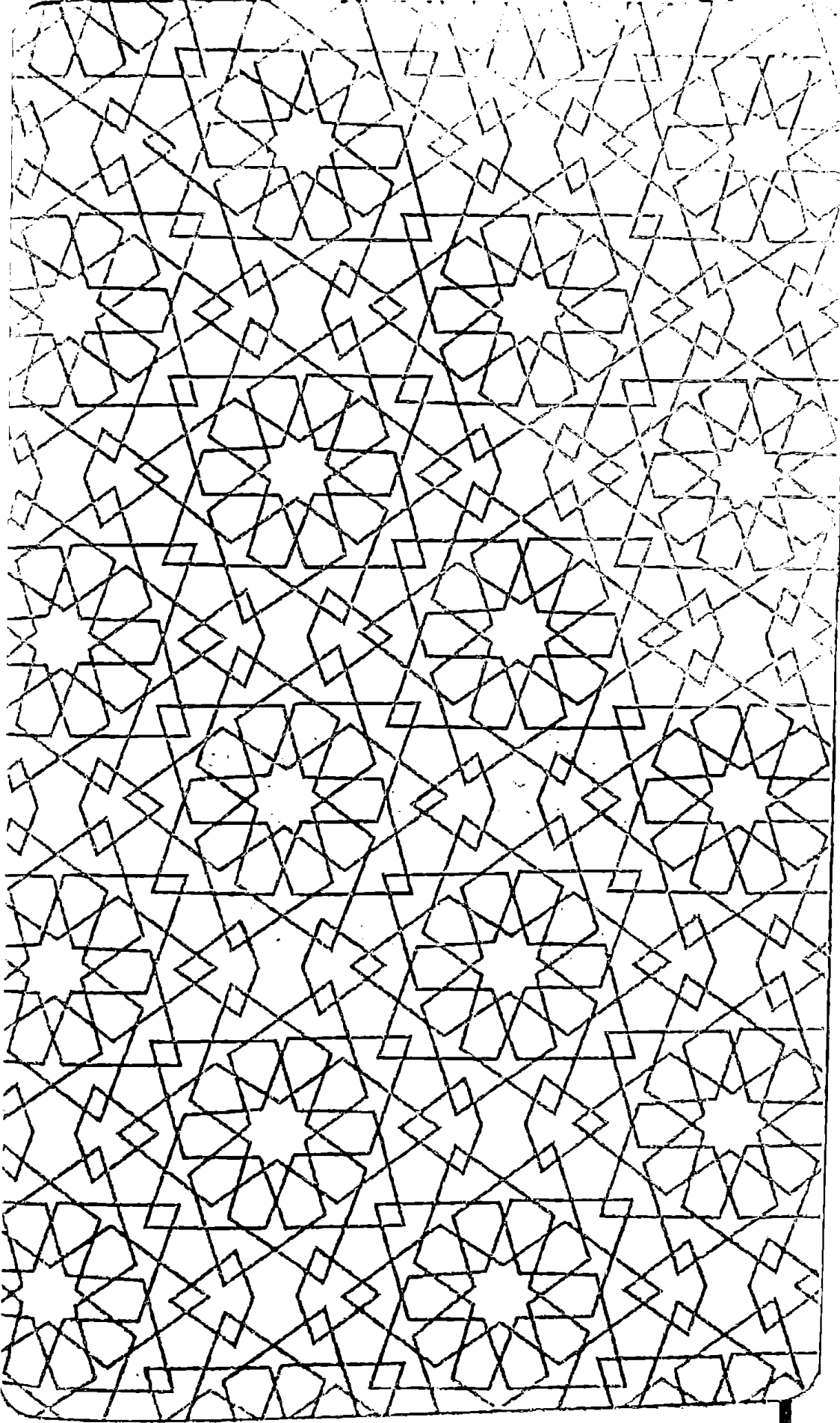
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہیے

الحمد للہ رب العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔ والصلوٰة والسلام علیٰ رسولہٖ الکریم۔ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ أمّا بعد!

تکبّر مع اللہ کی صورت

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تکبّر میں جب غلو ہوجاتا ہے اور اس کی جڑ پختہ ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی تکبّر کرنے لگتا ہے۔ مثلاً دعا میں عاجزی اور خشوع کر رہا تھا، رونے کی صورت بنا کر گڑگڑا رہا تھا کہ سامنے سے کوئی دوسرا شخص آ گیا تو اب گڑگڑانا چھوڑ دیا کہ دیکھنے والے کی نظر میں سبکی نہ ہو، یہ تکبّر مع اللہ ہے کہ اس کو اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت

کی صورت بنانے سے بھی دوسروں کی نظر میں ذلت و عار آتی ہے، پس مخلوق کے لیے کسی عملِ عبادت کو ترک کرنا تکبّر ہے۔ (انفاسِ عیسیٰ۔ص ۱۵۷)

تکبّر مع الناس اور تکبّر مع الخلق تو بُرا ہے ہی، لیکن اللہ جل شانہٗ کے ساتھ تکبّر کرنا بدترین قسم کا تکبّر ہے۔ مثلاً ایک شخص دعا میں روتا ہے اور گڑگڑاتا ہے یا رونے کا منہ بناتا ہے، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ عمل پسندیدہ عمل ہے، لیکن کسی اور کے سامنے اپنی دعا میں یہ عمل کرتے ہوئے اگر انسان یہ محسوس کرے کہ میری ذلت ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے میں اپنی خفت محسوس کر رہا ہے -العیاذ باللہ- یہ بہت خطرناک قسم کا تکبّر ہوا۔

مخلوق کے لیے عمل کا ترک

مذکورہ ارشاد کے آخر میں حضرتِ والا نے یہ اصول بیان فرمادیا کہ ''پس مخلوق کے لیے کسی بھی عمل اور عبادت کو ترک کرنا تکبّر ہے۔'' جس طرح مخلوق کے لیے عمل کرنا ریاکاری اور دکھاوا ہے، یعنی مخلوق کی خاطر عمل کرنا کہ مخلوق مجھے دیکھ کر عبادت گزار سمجھے، جس طرح یہ عمل ریا ہے بلکہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، اسی طرح ترکِ عمل لِلخلق بھی جائز نہیں، اس لیے یہ ترکِ عمل یا تو ریا ہوگا یا تکبّر میں داخل ہوگا۔

تکبّر مع اللہ کی مثال

مثلاً نماز کا وقت آ گیا اور آپ اس وقت ایسی جگہ پر ہیں جہاں نماز کا

ماحول نہیں، اب اگر آپ وہاں نماز پڑھنے سے اس لیے شرمائیں کہ لوگ مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر معلوم نہیں کیا سمجھیں گے ۔العیاذ باللہ۔تو یہ ترکِ عمل لِلخلق ہے جو جائز نہیں۔ آج کل بہت کثرت سے یہ صورت پیش آتی رہتی ہے، مثلاً جو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جہاز میں نماز معاف ہے اور نماز کو چھوڑنے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ تو بیٹھے ہیں، اب اگر میں ان سب کے سامنے کھڑا ہوکر نماز پڑھوں گا تو ایک بھدّی صورت پیدا ہوجائے گی ۔العیاذ باللہ۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اب جو شخص اس وقت نماز کو ترک کررہا ہے وہ مخلوق کے سامنے اس عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہ رہا، اس لیے کہ اس سے میری ہیٹی ہوگی،تو یہ صورت ''تکبر مع اللہ'' ہے۔

ایسے مقامات پر نماز نہ چھوڑیں

غیر مسلم ملکوں میں میرا اکثر جانا ہوتا ہے، وہاں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں غیر مسلموں کی آمد و رفت ہے یا جہاں غیر مسلم کثرت سے موجود ہیں، وہاں بعض مسلمان نماز پڑھنے سے کتراتے ہیں، اس لیے کتراتے ہیں کہ اگر ہم یہاں نماز پڑھیں گے تو ہم ان کے سامنے تماشہ بن جائیں گے۔ اب اس ڈر سے نماز چھوڑنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غیر مسلم لوگ ہمارا مذاق اُڑائیں اور ہمیں تماشہ سمجھیں اور اس نماز کی ہیئت کو ذلت کی ہیئت سمجھ کر ترک کرنا اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس ہیئت میں آنے سے پرہیز کرنا یہ ''تکبر مع اللہ'' ہے۔ واقعۃً بعض جگہیں ایسی ہیں کہ اگر آدمی وہاں نماز پڑھے تو ایک تماشہ بن جاتا ہے اور لوگ آکر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔

اُندلس (اسپین) کے ایئرپورٹ پر نماز

اب تو چونکہ مسلمان ہر جگہ پہنچ گئے ہیں، اس لیے الحمد للہ نماز اتنی اجنبی نہیں رہی۔ مجھے تو ایسی ایسی جگہوں پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک انسان بھی کلمہ گو نہیں تھا، لیکن سب سے زیادہ حسرت مجھے اُندلس (اسپین) میں ہوئی، وہ اُندلس جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی اور آٹھ سو سال تک جس کی فضاؤں میں اذان کی آوازیں گونجتی رہیں، جب میں وہاں ایئرپورٹ پر اُترا تو نماز کا وقت تھا، نماز پڑھنے کے لیے ایک گوشہ تلاش کیا تا کہ وہاں نماز ادا کریں۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے، چنانچہ ایک گوشہ میں ہم دونوں نے نماز شروع کردی، وہ گوشہ ایسا نہیں تھا جو بہت نمایاں ہو، اس لیے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے ایسا گوشہ تلاش کرتا ہے جو ذرا آڑ میں ہو، لیکن میں نے دنیا میں لوگوں کے لیے نماز اتنی انجانی اور اجنبی محسوس نہیں کی جیسی وہاں محسوس کی۔ پہلے تو ہمیں نماز پڑھتا دیکھ کر دو چار آدمی کھڑے ہوگئے، پھر وہ لوگ دوسروں کو بلا بلا کر لائے کہ دیکھو یہ کیا ہورہا ہے، پھر تو باقاعدہ ہمیں دیکھنے کے لیے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، گویا کہ آج تک انہوں نے یہ نظارہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

مجھے حسرت اس بات کی ہوئی کہ مجھے امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جو کفر کے بڑے بڑے مراکز ہیں ان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن کہیں بھی نماز اتنی اجنبی محسوس نہیں کی گئی جتنی اُندلس کے ایئرپورٹ پر محسوس کی گئی۔ اب اگر آدمی اس وجہ سے نماز چھوڑ دے کہ اگر میں یہاں نماز پڑھوں گا تو یہ لوگ تماشہ بنائیں گے اور برا سمجھیں گے یا نماز پڑھنے سے میری خفت ہوگی، تو یہ خطرناک خیال ہے اور یہ ''تکبّر مع اللہ'' ہے۔

ایسے موقع پر نماز مؤخر کردے

بعض جگہ نماز کو مؤخر کرنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے سے کہیں اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہوجائے۔ مثلاً ایک شخص ریل گاڑی میں سفر کررہا ہے یا جہاز میں سفر کررہا ہے اور نماز پڑھنے کے لیے اتنی جگہ ضروری ہے جس میں آدمی سجدہ کرسکے، لیکن نماز پڑھنے کے لیے اتنی جگہ حاصل کرنے کے لیے دوسرے کو تکلیف پہنچانی پڑے گی یا کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھانا پڑے گا، تو اگر اس تکلیف سے دوسرے کو بچانے کے لیے آدمی نماز موخر کردے تو یہ مؤخر کرنا درست ہے، اس لیے کہ دوسرے کو تکلیف دے کر نماز پڑھنے سے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی ہوگی اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو تکلیف دیتا ہے، لہٰذا اس وجہ سے نماز کا مؤخر کرنا صحیح ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

دوسری انتہاء

بہرحال! ایک انتہاء تو یہ ہے کہ لوگ جہازوں میں نماز پڑھنے سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ کہیں دوسروں کے سامنے تماشہ نہ بن جائیں اور نماز پڑھنے سے کہیں ہماری خفت نہ ہو۔ العیاذ باللہ۔ یہ تو تکبّر مع اللہ ہے۔ دوسری انتہاء وہ ہے جو اس واقعے سے سامنے آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ جہاز میں سفر کررہا تھا، جہاز بھی چھوٹا تھا اور سفر بھی صرف ایک گھنٹے کا تھا، نماز کا وقت آ گیا تھا، لیکن منزل پر پہنچ کر جہاز سے اُتر کر آرام سے نماز پڑھ سکتے تھے۔ مگر میرے کچھ دوست جو میرے ساتھ تھے ان کا اصرار یہ تھا کہ نماز جہاز ہی میں

پڑھنی ہے یہاں وضو کرنا ہے، اذان دینی ہے اور پھر جماعت سے نماز پڑھنی ہے، چنانچہ جب وضو کرنے کا ارادہ کیا تو جہاز کے عملے نے منع بھی کیا کہ یہاں وضو کرنا مشکل ہوگا، لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور اصرار کیا کہ ہم تو وضو کریں گے، چنانچہ دو آدمیوں نے غسل خانے میں جاکر اس شان سے وضو کیا کہ غسل خانے کا سارا فرش گیلا ہوگیا اور اس میں پانی بھر گیا۔ حالانکہ آدمی جب وضو کرے تو اس طرح وضو کرنا چاہیے کہ بعد میں آنے والے کو غسل خانے کے استعمال سے تکلیف نہ ہو، لیکن ان حضرات نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اس کے بعد اذان دی اور پھر کہا ہم تو جماعت سے نماز پڑھیں گے، اب کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، ان سب کے درمیان انہوں نے صف بنا کر نماز شروع کردی، چونکہ بہرحال! جہاز کے عملے کے لوگ مسلمان تھے، انہوں نے ان کی رعایت تو کی، لیکن ہر ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو! انہوں نے کیا حرکت کی ہے۔ اب اگر ایک گھنٹے بعد آرام سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر وضو کرکے نماز پڑھ لیتے تو اس میں کیا حرج ہوجاتا، لیکن اس عمل کے نتیجے میں ایک ہنگامہ پیدا کردیا۔ اس کے نتیجے میں غسل خانہ الگ خراب کیا۔ اب جو شخص بھی غسل خانے میں جارہا ہے وہ ان کو بُرا کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، لوگوں کا راستہ الگ بند کیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ ابھی نماز کو رہنے دو، میں بھی جہاز سے اُتر کر نماز پڑھوں گا، لیکن ان لوگوں نے بالکل نہیں سنی، یہ دوسری انتہاء ہے۔

ہوائی جہاز میں وضو کرنے کا طریقہ

اس دوسری انتہاء میں ہم جیسے لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں اور ہمیں ان باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔ جہاز کا عملہ ہمیشہ لوگوں کو جہاز میں وضو کرنے سے منع کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ یہ شخص غسل خانہ میں جا کر وضو کرے گا تو اس کو روک دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کو معلوم ہے کہ جب یہ شخص وضو کرے گا تو سارا غسل خانہ خراب کر کے آئے گا۔ میں جہازوں میں اکثر سفر کرتا رہتا ہوں اور جہاز کے غسل خانہ میں ہمیشہ وضو کرتا ہوں، مجھے آج تک کسی نے وضو کرنے سے منع نہیں کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں کہ جب میں وضو کر کے باہر نکلوں تو فرش پر پانی کی ایک چھینٹ بھی باقی نہ رہے اور غسل خانے کا واش بیسن بالکل صاف ستھرا رہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لہٰذا اگر ہم صفائی کا ذرا اہتمام کریں تو کوئی مشکل کام نہیں، غسل خانے میں تولیے موجود ہوتے ہیں اور ٹیشو پیپر، ٹوائلٹ پیپر ہوتے ہیں۔ آدمی فرش اور واش بیسن کو ان سے صاف کرلے، لیکن ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ بس ہم تو لِلّٰہ فی اللہ وضو کر کے آگئے، اب بعد میں آنے والے پر کیا گزرے گی اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

دوہرا گناہ

حالانکہ اس گندگی کے نتیجے میں دوسروں کو تکلیف دینے کا گناہ الگ ہوگا اور لوگوں کو اسلام سے اور دین کے شعائر سے متنفر کرنے کا گناہ الگ ہوگا۔ العیاذ باللہ۔

حدیث شریف میں تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں:

"یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا"(۱)

"لوگوں کے لیے دین کو آسان کرو اور مشکل مت بناؤ۔
لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور ان کے اندر نفرت مت پیدا کرو۔"

آج ہم نے ان چیزوں کو دین سے خارج ہی کردیا ہے، آج ہماری مسجدوں کے غسل خانوں اور بیت الخلاء کو جاکر دیکھو تو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اندر داخل ہونا مشکل ہے اور داخل ہونا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ یہاں تو متقی اور پارسا لوگ رہتے ہیں، یہاں رہنے والے علماءِ کرام اور صوفیاءِ عظام ہیں، ان کو صفائی ستھرائی سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے ان کا غسل خانہ گندہ ہے اور اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ ان علماء کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ یہ بھی کوئی گناہ کا کام ہے یا کوئی ناجائز کام ہے۔

یہ حرکت گناہِ کبیرہ ہے

میرے والدِ ماجد قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ یاد آیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ ہم نے غسل خانہ کو استعمال کیا اور اس کو صاف کیے بغیر اور پانی بہائے بغیر باہر آگئے۔ جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چلا تو آپ نے ہمیں بلایا اور پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے یہ معمولی حرکت کی؟ تمہاری یہ حرکت گناہِ کبیرہ ہے، اس لیے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے اور تم یہ سمجھ کر آگئے کہ ہم نے کوئی برا کام نہیں کیا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۲۵/۱ (۶۹)۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

دیکھیے! یہ جو کافر اور غیر مسلم ہیں، ان کا کفر باعثِ نفرت ہے، لیکن انہوں نے کچھ چیزیں ایسی اختیار کرلیں جو ہماری تھیں، ان چیزوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو دنیا میں عروج اور ترقی دے دی۔ میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اُبھر سکے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا(۱)

باطل تو ڈوبنے کے لیے اور ذلیل ہونے کے لیے ہے۔ اس میں اُبھرنے کی طاقت نہیں، لہٰذا اگر تم کبھی یہ دیکھو کہ باطل اُبھر رہا ہے، عزت حاصل کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، جس نے اس باطل کو اُبھار دیا ہے، حق کے سہارے کے بغیر باطل کبھی نہیں اُبھر سکتا۔

لہٰذا یہ جتنی ترقی یافتہ قومیں جو آج کی دنیا میں ترقی کرتی نظر آرہی ہے، چاہے وہ امریکہ ہو یا یورپ ہو یا کوئی اور ہو۔ یہ ترقی ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اور باطل کی وجہ سے نہیں ہورہی ہے، بلکہ انہوں نے کچھ اچھے کام اختیار کرلیے۔ مثلاً محنت، امانت، دیانت، حسنِ معاشرت وغیرہ جو اصل میں اسلام کی تعلیمات تھیں۔ ان کو اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دے دی اور فرمایا کہ ٹھیک ہے تم نے اچھا کام کیا، اس کا صلہ ہم تمہیں دنیا میں دے دیتے ہیں، آخرت میں تو تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

---

(۱) سورۃ الاسراء آیت (۸۱)۔

وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ(۱)

ایک سبق آموز واقعہ

میں ایک مرتبہ برطانیہ میں ریل کا سفر کر رہا تھا اور برمنگھم سے ایڈنبرا جارہا تھا، پانچ چھ گھنٹے کا سفر تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، جب وہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ غسل خانہ پر ''مشغول'' کی تختی لگی ہوئی ہے، میں واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد میں پھر گیا تو دیکھا کہ پھر بھی ''مشغول'' کی تختی لگی ہوئی ہے، پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جب گیا تو میں نے دیکھا کہ اب ''خالی'' کی تختی لگی ہوئی ہے، لیکن ایک خاتون باہر انتظار میں کھڑی ہیں، میں سمجھا کہ شاید اِن خاتون کو پتہ نہیں ہے کہ یہ غسل خانہ خالی ہے، اس لیے میں نے ان خاتون سے کہا کہ غسل خانہ خالی ہے، آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔ اس خاتون نے کہا کہ ہاں، یہ خالی ہے، مگر میں انتظار کر رہی ہوں؟ میں نے پوچھا کہ اب کس کا انتظار ہے؟ خاتون نے کہا کہ میں ابھی اندر سے فارغ ہو کر باہر نکلی ہوں، لیکن جس وقت میں فارغ ہوئی عین اس وقت گاڑی اسٹیشن پر رک گئی اور قانون یہ ہے کہ جس وقت اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی ہو، اس وقت ''فلش'' کرنا منع ہے۔ اس لیے میں اس وقت ''فلش'' نہیں کرسکی، اب میں گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کر رہی ہوں تاکہ جب یہ اسٹیشن سے روانہ ہوجائے تو اس کے بعد فلش کروں اور پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھوں، اس لیے انتظار میں کھڑی ہوں۔

---

(۱) سورۃ الشوریٰ آیت (۲۰)۔

ہمارا طرزِ عمل

جب میں نے اس خاتون کی یہ بات سنی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ دیکھو! یہ وہ تعلیم ہے جو ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ بغیر فلش کیے بیت الخلاء سے واپس آجانا گناہِ کبیرہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس خاتون نے ایک تو اِس بات کا اہتمام کیا کہ اسٹیشن پر ''فلش'' نہ ہو۔ ہمارے یہاں کوئی شخص اس کا اہتمام کرے گا؟ حالانکہ ہر غسل خانہ پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ ''جب تک گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو، اس وقت تک اس کو استعمال نہ کیا جائے''، لیکن کوئی دھیان نہیں کرتا۔ یہ اس لیے لکھتے ہیں پلیٹ فارم پر ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر گاڑی کھڑی ہونے کے وقت کوئی شخص غسل خانہ استعمال کرے گا تو پلیٹ فارم پر گندگی پھیلے گی اور اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی اور صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے، مگر ہم میں سے کوئی اس کا لحاظ نہیں کرتا۔

ایک عمل میں کئی گناہ

اور پھر اس کا لحاظ نہ کرنے کو کبھی کوئی شخص یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، حالانکہ اس ایک عمل میں کئی گناہ شامل ہیں۔ ایک گناہ تو یہ ہے کہ جب آپ کی وجہ سے ایسی جگہ پر گندگی پھیلی جو لوگوں کی گزرگاہ ہے، تو اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ گاڑی آپ کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ آپ کرایہ دے کر اس کو سفر کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا جن شرائط پر آپ کو گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ان شرائط کی

پابندی آپ کے اوپر لازمی ہے، اگر آپ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو یہ عقدِ اجارہ کی خلاف ورزی ہوگی، لہٰذا ان شرائط کے خلاف آپ کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

حق العبد کے ضیاع کا گناہ

اور ان دونوں گناہوں کا تعلق ''حقوق العباد'' سے ہے، اب اگر تمہارے اس عمل سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا تو پھر کس کس سے معافی مانگو گے؟ اس لیے یہ گناہ بڑا سنگین ہے، لیکن اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ہم لوگ دوسری انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں، اس کی بڑی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں صحیح فکر عطا فرمائے اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین۔

مساجد کے استنجا خانوں کا حال

اسلام جو لطافت کا، طہارت کا اور نظافت کا دین تھا، آج ہم نے اپنے طرزِ عمل سے اس دین کو گندگی کا دین بنادیا ہے۔ برطانیہ میں خاص طور پر یہ منظر نظر آتا ہے کہ آپ پورے ملک میں کہیں بھی چلے جائیں، چاہے کسی آفس میں چلے جائیں یا کسی تفریح گاہ پر چلے جائیں، ہر جگہ آپ کو صاف ستھرے غسل خانے ملیں گے۔ الا ماشاء اللہ، لیکن اگر کسی مسجد کے غسل خانے میں چلے جائیں تو (العیاذ باللہ) اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ سوائے ان چند مساجد کے جو بہت اچھی بنی ہوئی ہیں، ان میں صفائی ستھرائی کا نظام اچھا ہے، باقی اکثر مساجد میں صفائی کا نظام

خراب ہے اور اس وقت صرف لندن شہر میں ڈھائی تین سو مسجدیں ہیں، جب کہ ایک وقت وہ تھا کہ نماز پڑھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی، لیکن ان میں صفائی کا اہتمام نہیں ہے۔ پورے لندن میں سب سے گندہ علاقہ مسجد کے غسل خانوں کا ہے، اس کے ذریعے ہم اسلام کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں، جو دین طہارت کا، نظافت کا اور لطافت کا دین تھا اس کو ہم نے گندگی کا دین بنا کر پیش کر دیا۔

ایک انگریز مسلمان کا قصہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد میں ایک انگریز مسلمان ہوگیا۔ اب مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں آنے لگا، اس نے دیکھا کہ وضو خانے کی نالی گندی ہو رہی ہے، چند روز تک تو وہ دیکھتا رہا، جب کسی اور نے صفائی نہیں کی تو ایک دن وہ جھاڑو لے کر آیا اور پانی ڈال کر اس کی صفائی شروع کردی۔ ایک صاحب وہاں سے گزرے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ انگریز نالی صاف کر رہا ہے تو ان صاحب نے کہا کہ

> ''یہ انگریز مسلمان تو ہوگیا، لیکن ابھی انگریزیت کی خُوبُو نہیں گئی۔''

مطلب یہ تھا کہ یہ جو صفائی کر رہا ہے یہ انگریزیت کی خوبو ہے۔العیاذ باللہ۔

بھائی! ہم لوگوں نے اپنا یہ گندہ حلیہ بنا رکھا ہے، یہ فی نفسہ ناجائز تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے سے اسلام کی غلط تصویر لوگوں کے سامنے آ رہی ہے، جس کے نتیجے میں لوگ دین کے قریب آنے کے بجائے اور

دور ہو رہے ہیں، لہٰذا ہمیں صفائی کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
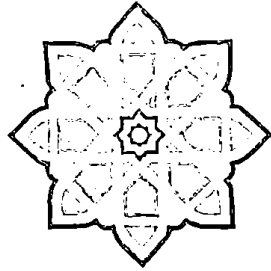
جزا وسزا کا تصور

(نشری تقریریں ص ۱۷، فرد کی اصلاح ص ۴۱)
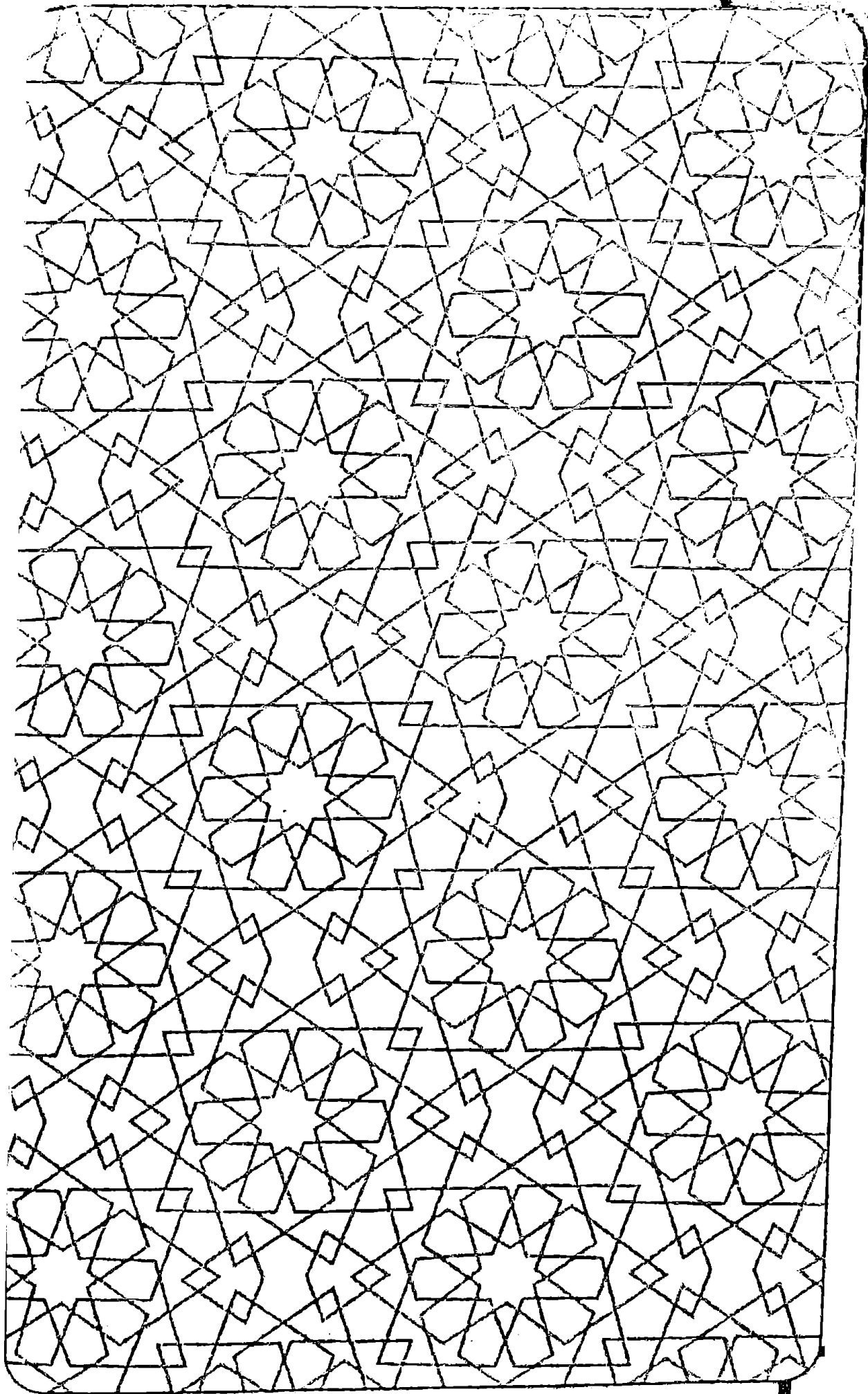
بسم اللہ الرحمن الرحیم

جزا وسزا کا تصور

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد!

اسلام کی بنیاد جن عقائد پر ہے، ان میں توحید اور رسالت کے بعد اہم ترین عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد ایک ایسی دائمی زندگی سے سابقہ پیش آئے گا جس میں انہیں ان تمام کاموں کا حساب دینا ہوگا جو اس نے دنیا میں انجام دیے، اسی دائمی زندگی کو آخرت کہا جاتا ہے اور قرآنِ کریم نے جا بجا یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آخرت میں انسان کو اپنے نیک اور اچھے کاموں پر انعام اور برے کاموں پر سزا دی جائے گی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ[1]

پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے (آخرت

(۱) سورۃ الزلزال آیت (۷-۸)۔

میں) دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھے گا۔

آخرت کی دائمی زندگی اگرچہ فی الحال ہمیں نظر نہیں آتی، لیکن آخرت کی جزا وسزا درحقیقت ہماری اس دنیوی زندگی کا لازمی تقاضا ہے۔

ہم جب دیکھتے ہیں کہ کائنات کا یہ نظام کتنے مضبوط مستحکم اور حکیمانہ اصولوں پر چل رہا ہے تو لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آگئی، بلکہ اسے کسی ایسے علیم وحکیم خالق نے پیدا کیا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں ان میں شریف بھی ہیں شریر بھی، پرہیزگار بھی ہیں گناہگار بھی، ظالم بھی ہیں مظلوم بھی، لہٰذا اگر یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ ہو اور اس کے بعد کوئی زندگی آنے والی نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس طرح نہ اچھے آدمیوں کو ان کی اچھائی کا کوئی انعام مل سکتا ہے اور نہ گناہ گاروں اور ظالموں کو ان کے ظلم اور زیادتی اور نافرمانی کا بدلہ دیا جاسکتا ہے اور یہ بات خالقِ کائنات کی حکمت سے ممکن نہیں کہ وہ ظالموں اور مظلوموں اور نیکو کاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی جیسا معاملہ کرے، لہٰذا یہ کائنات خود اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ مرنے سے انسان کی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ مرنے کے بعد انسان اس عالم میں چلا جاتا ہے جہاں اس کو اس کی دنیوی زندگی کی جزا یا سزا ملتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ[1]

تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت اور جزا وسزا کا قیام ایک عقلی ضرورت ہے اور اس کے بغیر کائنات، یہ پورا کارخانہ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اَن دیکھے حقائق سے باخبر کرنے اور اپنے احکام کی تعلیم دینے کے لیے جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے، عقیدۂ آخرت کی تعلیم نہایت اہتمام کے ساتھ دی ہے اور آخرت کے واقعات کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے، خود قرآنِ کریم کا کم و بیش ایک تہائی حصہ آخرت اور جزاوسزا ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

قرآن وسنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں عقیدۂ آخرت پر اس قدر اہمیت کے ساتھ اس لیے زور دیا گیا ہے کہ انسان کو انسان بنانے کے لیے جزا وسزا کے پختہ یقین سے زیادہ مؤثر کوئی نہیں، جب تک انسان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت پیوست نہ ہو کہ اسے اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک قول وفعل کا جواب دینا ہے اس وقت تک وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے اور اس کو گناہوں، بری عادتوں اور فاسد اخلاق سے نجات نصیب نہیں ہوتی۔

اگر آخرت کی جوابدہی انسان کے پیشِ نظر نہیں ہے دنیا کا سخت سے سخت قانون بھی اسے جرائم اور بداخلاقی کے ارتکاب سے نہیں روک سکتا، کیونکہ پولیس

---

(۱) سورۃ المومنون آیت (۱۱۵)۔

اور عدالت کا خوف زیادہ سے زیادہ دن کی روشنی اور شہر کے ہنگاموں میں اسے جرم سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن رات کی تاریکی اور جنگل کی تنہائی میں بھی انسان کے دل پر پہرا بٹھانے والی چیز اللہ کا خوف اور فکرِ آخرت کے سوا کچھ نہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئس سال کی مختصر مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا فرمایا اس کا ایک راز یہ تھا کہ آپ نے اپنی شب و روز کی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کے دل میں آخرت کا تصور اس قوت کے ساتھ جاگزیں کر دیا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آخرت کے حساب و کتاب کو ہر وقت اس طرح پیشِ نظر رکھتے تھے جیسے وہ اسے کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں۔

چنانچہ آخرت کی یہ فکر ان سے ایسے ایسے مشکل کام بآسانی کرا لیتی تھی جو سالہا سال کی تعلیم و تربیت کے بعد بھی انجام دینے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک شراب نوشی ہی کی عادت کو لیجیے، آج دنیا کی بیشتر مہذب اقوام اس بات پر متفق ہیں اور عقلی اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتی ہیں، کہ شراب نوشی ایک بری عادت ہے جو انسان کی صحت کو بھی تباہ کرتی ہے اور اخلاق کو بھی، چنانچہ اس موضوع پر بڑے بڑے گراں قدر مقالے لکھے جاتے رہے ہیں اور بڑی فاضلانہ تحقیقات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں، لیکن آج کی مہذب اقوام جنہیں اپنی عقل و خرد اور سائنٹیفک ترقیات پر بڑا ناز ہے، اپنے تمام ناقابلِ تردید دلائلِ مؤثر اعداد و شمار، نشر و اشاعت کے ترقی یافتہ ذرائع اور ذہن بدلنے کے جدید ترین وسائل استعمال کرنے کے باوجود شراب کے عادی افراد سے شراب چھڑانے میں قطعی ناکام ہو چکی ہیں، آج کی مہذب دنیا تعلیم و تربیت اور اخلاقی ترغیب سے لے کر تعزیری قوانین تک شراب کا استعمال ختم کرانے کے لیے ہر

تدبیر آزما چکی ہے، لیکن شراب نوشی کے اعداد و شمار روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

اس کے برعکس عرب کے اس معاشرے کا تصور کیجیے جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور تک عربوں کا حال یہ تھا کہ گھر گھر میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی، اس سے عربوں کی والہانہ محبت کا عالم یہ تھا کہ عربی زبان میں شراب کے لیے کم و بیش ڈھائی سو الفاظ ملتے ہیں اور شراب نوشی ان کے نزدیک عیب تو کیا ہوتی اسے سرمایۂ فخر و ناز سمجھا جاتا تھا، لیکن جب قرآنِ کریم نے حرمتِ شراب کا اعلان فرمایا تو اس قوم نے یکلخت اپنے اس محبوب ترین مشروب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حرمتِ شراب کی آیات نازل ہوئیں تو ایک مجلس میں شراب کا دور چل رہا تھا، جب میں نے ان کو یہ آیتیں سنائی تو بعض لوگوں کے ہونٹ کے ساتھ پیالہ لگا ہوا تھا اور چند گھونٹ منہ میں تھے، انہوں نے آیات سننے کے بعد یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ گھونٹ منہ میں سے حلق سے اتار لیں، بلکہ کلی کر کے پیالہ بہا دیا[1]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مجلس میں شراب کا ساقی بنا ہوا تھا، اچانک منادی کی آواز سنائی دی کہ شراب حرام کر دی گئی، تو پوری محفل نے شراب کو بہا دیا اور مٹکے توڑ ڈالے اور مدینہ کی گلیوں میں شراب پانی کی طرح

---

(۱) تفسیر طبری ۶۶۱/۸ طبع دار ہجر۔

بہنے لگی[1]، عادات و اخلاق کی یہ حیرت انگیز کایا پلٹ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت اور خشیت اور اس جزا و سزا کے عقیدے کی بناء پر ہوئی، جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رگ و پے میں پیوست فرما دیا تھا، اسی عقیدے کا نتیجہ تھا کہ اول تو عہدِ رسالت میں جرائم کی شرح گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچ گئی تھی اور اگر بشری تقاضے کی بنا پر کسی سے کوئی جرم سرزد ہوا بھی تو اسے گرفتار کرنے کے لیے کسی پولیس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی، بلکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اور اصرار کر کے اپنے اوپر سزا جاری کروائی[2]، کیونکہ یہ حقیقت ان کے دل میں پیوست تھی کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور قابلِ برداشت ہے، آج بھی اگر کوئی چیز دنیا کو جرائم، بد اخلاقی، بد امنی اور دھوکہ و فریب سے نجات دلا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ کا خوف، فکرِ آخرت اور جزا و سزا کی تیاری کا دھیان ہے، لیکن اس کے لیے ان عقائد کا محض زبانی اقرار کافی نہیں، بلکہ ان کو ہر وقت مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں آخرت کی جو تفصیلات بیان فرمائی گئی ہیں انہیں بار بار پڑھا جاتا رہے اور زندگی کی بے شمار مصروفیات میں سے کچھ وقت یہ سوچنے کے لیے نکالا جائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

(۱) صحیح البخاری ۳/۱۳۲ (۲٤٦٤) و ٦/٥٤ (٤٦٢٠)۔

(۲) ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۳/۱۳۲۱ (۱٦۹٥) و سنن ابی داود ٤/۱٤٥ (٤٤۱۹)۔

"اکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت"(۱)

لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد رکھا کرو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

(۱) الزہد لابن المبارک ۳۷/۲ و سنن الترمذی ۱۴۱/۴ (۲۳۰۷) وقال : ھذا حدیث حسن غریب۔ والسنن الکبری للنسائی ۳۷۹/۲ (۱۹۶۳)۔
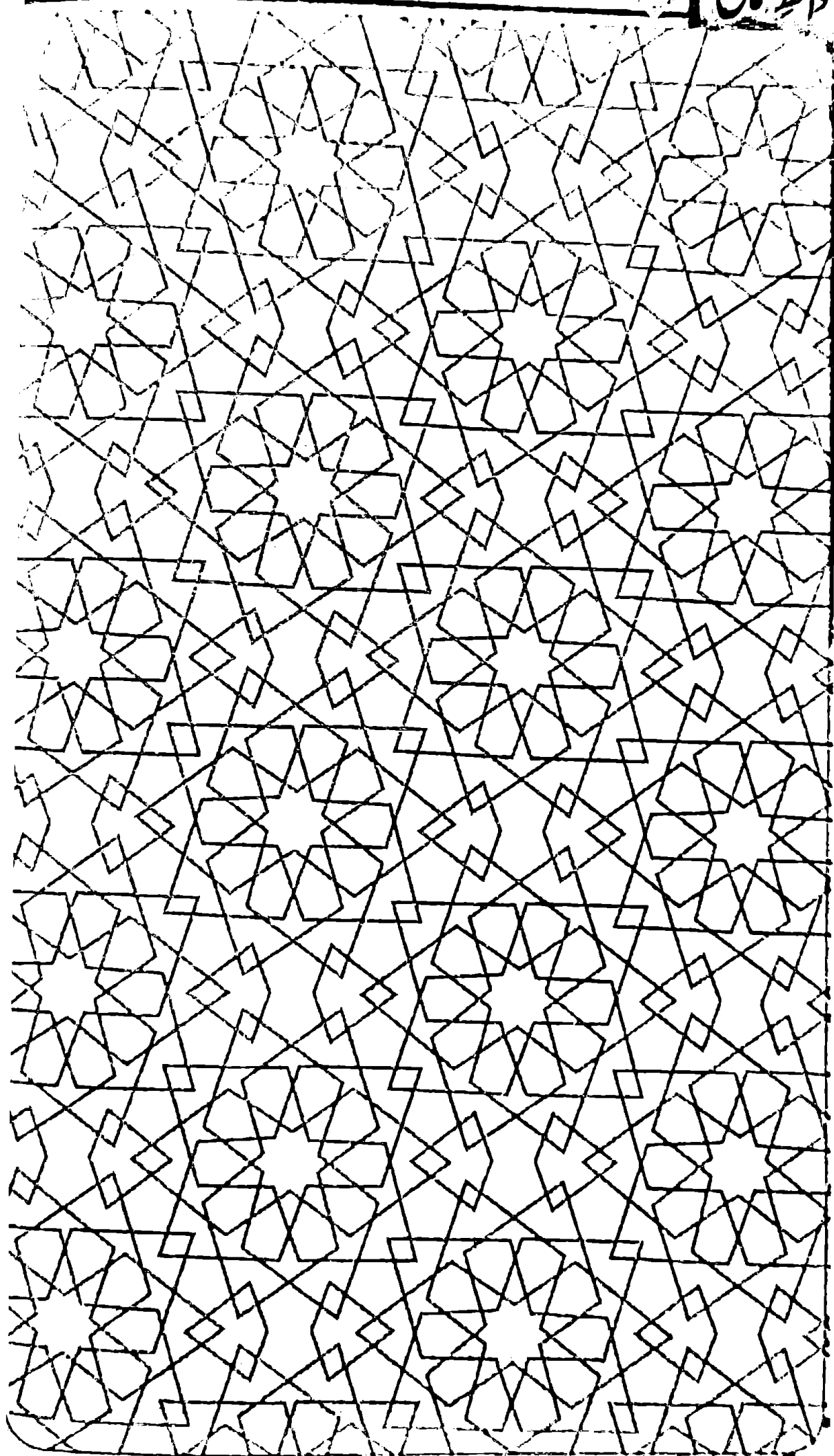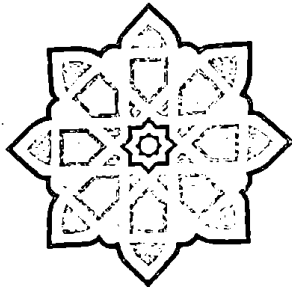
جنت کے مناظر

(اصلاحی خطبات ج ۹ ص ۲۳۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنت کے مناظر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أمّا بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَکُمْ فِیْھَا فَاکِھَۃٌ کَثِیْرَۃٌ مِّنْھَا تَاْکُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ [1]

---

(۱) سورۃ الزخرف آیت (۷۲-۷۳)۔

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

آخرت کے حالات جاننے کا راستہ

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مرنے کے بعد کے حالات جاننے کا انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی علم، کوئی فن اور کوئی معلومات ایسی نہیں ہیں جو انسان کو مرنے کے بعد کے حالات سے باخبر کرسکیں۔ جو شخص اس دنیا سے وہاں چلا جاتا ہے اس کو وہاں کے حالات کی خبر ہوتی ہے، لیکن ہمیں پھر اس جانے والے کی خبر نہیں رہتی۔

ایک بزرگ کا عجیب قصہ

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک بزرگ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے مریدین نے ایک مرتبہ ان بزرگ سے کہا کہ حضرت! جو شخص بھی مرنے کے بعد اس دنیا سے جاتا ہے وہ ایسا جاتا ہے کہ پلٹ کر خبر نہیں لیتا، نہ تو یہ بتاتا ہے کہ کہاں پہنچا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے کیا مناظر دیکھے، کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ ہمیں بھی وہاں کی کوئی خبر مل جائے۔ ان بزرگ نے فرمایا: ایسا کرو کہ جب میرا انتقال ہوجائے اور مجھے قبر میں دفن کرو تو قبر کے اندر میرے پاس تم ایک کاغذ اور ایک قلم رکھ دینا۔ مجھے اگر موقع ملا تو میں لکھ کر تمہیں وہاں کی خبر بتلادوں گا کہ وہاں کیا واقعات پیش آئے۔ لوگ بہت خوش

ہوئے کہ چلو کوئی بتانے والا ملا۔

جب ان بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کو دفن کرتے وقت ان کے ساتھ ایک کاغذ اور قلم بھی رکھ دیا۔ ان بزرگ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ دوسرے دن قبر پر آکر وہ کاغذ اُٹھا لینا، اس پر تمہیں لکھا ہوا ملے گا۔ چنانچہ اگلے دن لوگ ان کی قبر پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرچہ ان کی قبر پر لکھا ہوا پڑا ہے۔ اس پرچے کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے کہ آج ہمیں اس دنیا کی خبر مل جائے گی، لیکن جب پرچہ اُٹھا کر پڑھا تو اس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ

''یہاں کے حالات دیکھنے والے ہیں، بتانے والے نہیں''

واللہ اعلم، یہ واقعہ کیسا ہے؟ سچا یا جھوٹا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے کہ ایسا کردے، اس لیے یہ واقعہ سچا بھی ہوسکتا ہے اور جھوٹا اور من گھڑت بھی ہوسکتا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہاں کے حالات بتانے کے نہیں ہیں، دیکھنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہاں کے حالات کو ایسا راز کے اندر رکھا ہے کہ کسی پر بھی ذرا سا ظاہر نہیں ہوتا۔ بس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں جتنی باتیں بتادیں اس سے زیادہ کسی کو وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ قرآن وحدیث کے ذریعے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کو یہاں پر تھوڑا سا بیان کرنا مقصود ہے۔

ادنیٰ جنتی کی جنت کا حال

چنانچہ حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے پروردگار! اہلِ جنت میں سب سے کم درجہ کس کا ہوگا اور سب سے ادنیٰ آدمی جنت میں کون ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب سارے جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے، ایک آدمی جنت میں جانے سے رہ گیا ہوگا اور جنت کے آس پاس کے علاقے میں بیٹھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جب تم دنیا میں تھے اس وقت تم نے بڑے بڑے بادشاہوں کا ذکر سنا ہوگا، ان بادشاہوں میں سے اپنی مرضی سے چار بادشاہوں کا انتخاب کرکے میرے سامنے بیان کرو اور پھر ان بادشاہوں کی سلطنتوں کے جتنے حصے تھے، ان میں سے جتنے حصوں کا تم نام بیان کرسکتے ہو بیان کرو، چنانچہ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! میں نے فلاں فلاں بادشاہ کا ذکر سنا تھا، ان کی سلطنت بڑی عظیم تھی، اس کو بڑی نعمتیں ملی ہوئی تھیں، میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی ویسی ہی سلطنت مل جائے۔ اس طرح وہ ایک ایک کرکے چار مختلف بادشاہوں کی سلطنت کا نام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تم نے ان کی سلطنتوں کے اور ان کے علاقے کے نام تو بتادیے، لیکن ان بادشاہوں کو جو لذتیں حاصل تھیں ان کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ فلاں بادشاہ ایسے عیش وآرام میں ہے، ان لذتوں میں سے جو لذت تم حاصل کرنا چاہتے ہو، ان کا ذکر کرو۔ چنانچہ وہ شخص ان لذتوں کا ذکر کرے گا کہ میں نے سنا تھا کہ فلاں بادشاہ کو یہ نعمت حاصل تھی، فلاں بادشاہ کو یہ لذت حاصل تھی، یہ لذتیں مجھے بھی مل جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے کہ جن بادشاہوں کا تم نے نام لیا ہے، ان کی جن سلطنتوں کو تم نے گنوایا ہے اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم

نے ذکر کیا ہے اگر وہ تمہیں مل جائیں تو تم راضی ہو جاؤ گے؟ وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا اللہ! اس سے بڑی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے، میں تو ضرور راضی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا تم نے جتنی سلطنتوں کا نام لیا اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے نام لیا اس سے دس گنا زیادہ تمہیں عطا کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ جنت کا سب سے کم تر آدمی جس کو سب سے ادنیٰ درجے کی جنت ملے گی وہ یہ شخص ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یا اللہ! جب ادنیٰ آدمی کا یہ حال ہے تو جو آپ کے پسندیدہ بندے ہوں گے جن کو اعلیٰ ترین درجات عطا کیے گئے ہوں گے، ان کا کیا حال ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! جو میرے پسندیدہ بندے ہوں گے ان کے اکرام کی چیزیں تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنا کر ان کو خزانوں میں مہر لگا کر محفوظ کر کے رکھ دی ہیں اور ان میں وہ چیزیں ہیں کہ

"فَلَمْ تَرَ عَيْنٌ وَلَمْ تَسْمَعْ أُذُنٌ وَلَمْ يَخْطُرْ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ"(۱)

یعنی وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ جو آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، آج تک کسی کان نے ان کا تذکرہ نہیں سنا اور آج تک کسی انسان کے دل پر ان کا خیال بھی نہیں گزرا، ایسی نعمتیں میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۱۷۶ (۱۸۹) و مصنف ابن ابی شیبہ ۷/۳۳ (۳۳۹۹۵) طبع الرشد۔

○ ایک اور ادنیٰ جنتی کی جنت

ایک اور حدیث میں خود حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کا حال بیان فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ ایسا شخص ہوگا جو اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ اگرچہ آدمی مؤمن ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اعمال خراب کیے ہیں تو پہلے اس کو ان اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس لیے اس کو پہلے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اب وہ شخص جہنم میں جھلس رہا ہوگا تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ یا اللہ! اس جہنم کی تپش اور اس کی گرمی نے تو مجھے جھلسا دیا ہے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لیے جہنم سے نکال کر اُوپر کنارے پر بٹھادیں تاکہ میں تھوڑی دیر کے لیے جلنے سے بچ جاؤں۔

اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ اگر ہم تمہیں وہاں بٹھادیں گے تو تم کہو گے کہ مجھے اور آگے پہنچادو۔ وہ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ بس ایک مرتبہ یہاں سے نکال کر اُوپر بٹھادیں، پھر آگے جانے کے لیے نہیں کہوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کو جہنم سے نکال کر اُوپر بٹھادیا جائے گا۔ جب وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھے گا اور کچھ اس کے ہوش وحواس ٹھکانے پر آئیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے یہاں بٹھادیا اور جہنم سے نکال تو دیا، لیکن ابھی جہنم کی لپٹ یہاں تک آرہی ہے، تھوڑی دیر کے لیے اور دور کردیں کہ یہ لپٹ بھی نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ آگے جانے کے لیے

نہیں کہوں گا، اب تو وعدہ خلافی کر رہا ہے؟ وہ کہے گا: یا اللہ! مجھے تھوڑا اور آگے بڑھا دیں تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گا اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو تھوڑا سا اور دور کر دیں گے اور اب اس کو اس جگہ سے جنت نظر آنے لگے گی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے جہنم سے تو نکال دیا اور مجھے یہ جنت نظر آرہی ہے، آپ تھوڑی اجازت دے دیں کہ میں اس جنت کا تھوڑا سا نظارہ کرلوں اور اس کے دروازے کے پاس جا کر دیکھ آؤں کہ یہ جنت کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو پھر وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! جب آپ نے اپنے کرم سے یہاں تک پہنچا دیا تو ایک جھلک مجھے جنت کی بھی دکھا دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تمہیں ایک نظر جنت کی دکھاؤں گا تو کہے گا کہ مجھے ذرا اندر بھی داخل کردیں۔ وہ شخص کہے گا: نہیں یا اللہ! مجھے صرف جنت کی ایک جھلک دکھا دیں، اس کے بعد پھر کچھ نہیں کہوں گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی ایک جھلک دکھا دیں گے، لیکن جنت کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں (سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں) جب آپ نے مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دیا، تو اب اے اللہ! اپنے فضل سے مجھے اندر بھی داخل فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھ ہم تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ تو وعدہ خلافی کرے گا، لیکن چل، جب ہم نے تجھے اپنی رحمت سے یہاں تک پہنچا دیا تو اب ہم تجھے اس میں داخل بھی کر دیتے ہیں اور جنت میں تجھے اتنا بڑا رقبہ دیتے ہیں جتنا پوری زمین کا رقبہ ہے۔ وہ شخص کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں اور میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ میں کہاں اور جنت کا اتنا

بڑا رقبہ کہاں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں مذاق نہیں کرتا ہوں، تمہیں واقعی جنت کا اتنا بڑا رقبہ عطا کیا جاتا ہے۔

حدیث ”مسلسل بالضحک“

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حدیث ہنستے ہوئے بیان فرمائی اور پھر جن صحابی نے یہ حدیث سنی تھی انہوں نے یہ حدیث اپنے شاگردوں کے سامنے ہنستے ہوئے بیان فرمائی، پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہنستے ہوئے بیان فرمائی، یہاں تک کہ حضور اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک جب بھی یہ حدیث بیان کی جاتی ہے تو بیان کرنے والا بھی ہنستا ہے اور سننے والے بھی ہنستے ہیں، اسی وجہ سے یہ حدیث ”مسلسل بالضحك“ کہلاتی ہے[1]۔

پورے کرۂ زمین کے برابر جنت

بہر حال! یہ وہ شخص ہوگا جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اب آپ اندازہ کریں کہ سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والے کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ جتنا پورا کرۂ زمین ہے، اتنا حصہ جنت میں عطا کیا جائے گا تو پھر اُوپر کے درجات والوں کا کیا حال ہوگا اور ان کو جنت میں کتنا بڑا مقام دیا جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں اس عالم کی ہوا بھی نہیں لگی، اس وجہ سے اس عالم کی

(۱) صحیح البخاری ۱۱۷/۸ (٦٥٧١) وصحیح مسلم ۱۷۳/۱ (۱۸٦)۔

وسعتوں کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے، اسی لیے ہمیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو پورے کرۂ ارض کے برابر جگہ کیسے ملے گی؟ اور اگر مل بھی جائے گا تو وہ اتنی بڑی زمین کو لے کر کیا کرے گا؟ یہ اشکال بھی اس لیے ہو رہا ہے کہ اس عالَم کی ہمیں ہوا بھی نہیں لگی۔

عالَمِ آخرت کی مثال

اس عالَمِ آخرت کے مقابلے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، اس بچہ کو اس دنیا کی ہوا نہیں لگی ہوتی، اس لیے وہ بچہ اس دنیا کی وسعتوں کا اندازہ نہیں کرسکتا، وہ بچہ ماں کے پیٹ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، لیکن جب وہ بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس وقت اس کو پتہ چلتا ہے کہ ماں کا پیٹ تو اِس دنیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا عالَم اپنی رضا کے ساتھ دکھادے، تو پتہ چلے کہ وہ عالَمِ آخرت کیا چیز ہے اور اس کے اندر کتنی وسعت ہے؟ اور وہ عالَم مؤمنوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

یہ جنت تمہارے لیے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ، جنت مؤمنوں کے لیے تیار کی گئی ہے، صاحبِ ایمان کے لیے تیار کی گئی ہے، اگر تم اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو کہ وہ تمہارے لیے ہی تیار کی گئی ہے، ہاں البتہ اس جنت تک پہنچنے کے لیے اور اس کے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تھوڑا سا کام کرنا ہے، بس وہ کام کرلو تو ان شاء اللہ

وہ جنت تمہاری ہے اور تمہارے لیے تیار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت عطاء فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین اور بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے استاذ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جمعہ کے دن کسی بازار میں چلا گیا، ان کو کوئی چیز خریدنی تھی، چنانچہ بازار جاکر وہ چیز خریدلی۔ جب بازار سے واپس لوٹنے لگے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے سعید! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں دونوں کو جنت کے بازار میں جمع کرے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان دیکھیے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحے آخرت کی کوئی نہ کوئی بات ادنیٰ سی مناسبت سے نکال کر اس کے دھیان کو اور اس کے ذکر کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ دنیا کی مشغولیات انسان کو اس طرح اپنے اندر مشغول نہ کردیں کہ انسان آخرت کو بھول جائے، لہٰذا دنیا کا کام کررہے ہیں، بازار میں خریداری کر رہے ہیں اور خریداری کے دوران شاگرد کے سامنے یہ دعا کردی۔

جنت کے اندر بازار

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابیِ رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا جنت میں بھی بازار ہوں گے؟ اس لیے کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ جنت میں ہر چیز مفت ملے گی اور بازار میں خرید و فروخت ہوتی

ہے۔ جواب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہاں پر بھی بازار ہوں گے، میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ ہر جمعے کے دن جنت میں اہلِ جنت کے لیے بازار لگا کرے گا۔ پھر اس کی تفصیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ جب اہلِ جنت جنت میں چلے جائیں گے اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے، خوب عیش وآرام سے زندگی گزار رہے ہوں گے، وہاں ان کو اتنی نعمتیں دی جائیں گی کہ وہاں سے کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کریں گے، تو اچانک یہ اعلان ہوگا کہ تمام اہلِ جنت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر آجائیں اور ایک بازار کی طرف چلیں، چنانچہ اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکلیں گے اور بازار کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں جاکر ایک ایسا بازار دیکھیں گے جس میں ایسی عجیب وغریب اشیاء نظر آئیں گی جو اہلِ جنت نے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں ہوں گی، ان اشیاء سے دکانیں سجی ہوں گی، لیکن خرید وفروخت نہیں ہوگی، بلکہ یہ اعلان ہوگا کہ جس جنتی کو جو چیز پسند ہو وہ دکان سے اٹھالے اور لے جائے۔ چنانچہ اہلِ جنت ایک طرف سے دوسری طرف بازار میں دکانوں کے اندر عجیب وغریب اشیاء کا نظارہ کرتے ہوئے جائیں گے اور ایک سے ایک نعمت ان کو نظر آئے گی اور جس کو جو چیز پسند آئے گی وہ اس کو اٹھا کر لے جائے گا[1]۔

جنت میں اللہ تعالیٰ کا دربار

جب بازار کی خریداری ختم ہوجائے گی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف

---

(۱) سنن الترمذی ۳۰۸/۴ (۲۵۴۹) وقال ہذا حدیث غریب لا نعرفه الا من ہذا الوجه۔ وسنن ابن ماجه ۶۹۷/۵ (۴۳۳۶) وصفة الجنة لابن ابی الدنیا ص ۱۸۱ (۲۴۵) طبع مکتبة ابن تیمیة-القاهرة. وصحیح ابن حبان ۴۶۶/۱۶ (۷۴۳۸)۔

سے یہ اعلان ہوگا کہ اب سب لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک اجتماع ہوگا اور یہ کہا جائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ جب دنیا میں تم رہتے تھے تو وہاں جمعہ کا دن آیا کرتا تھا تو تم لوگ جمعہ کی نماز کے لیے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہوا کرتے تھے، تو آج جمعہ کے اجتماع کا بدل جنت کے اس اجتماع کی صورت میں عطا فرمارہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا دربار لگا ہوا ہے، وہاں پر حاضر ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ تمام اہلِ جنت، اللہ تعالیٰ کے اس دربار میں پہنچیں گے۔ اس دربار میں ہر شخص کے لیے پہلے سے کرسیاں لگی ہوں گی، کسی کی کرسی جواہر سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی سونے سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی موتیوں سے بنی ہوگی اور کسی کی کرسی چاندی سے بنی ہوئی ہوگی، اس طرح حسبِ درجات کرسیاں ہوں گی۔ جو شخص جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا اس کی کرسی اتنی شاندار ہوگی، ان پر اہلِ جنت کو بٹھایا جائے گا اور ہر شخص اپنی کرسی کو اتنا اچھا سمجھے گا کہ اس کو یہ حسرت نہیں ہوگی کہ کاش مجھے ویسی کرسی مل جاتی جیسے فلاں شخص کی کرسی ہے، کیونکہ اس جنت کے عالم میں غم اور حسرت کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لیے اس کو عمدہ کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

جنت میں جو سب سے کم رتبے کے لوگ ہوں گے ان کے لیے کرسیوں کے اردگرد مشک وعنبر کے ٹیلے ہوں گے، ان ٹیلوں پر ان کی نشستیں مقرر ہوں گی، اس پر ان کو بٹھادیا جائے گا۔ جب سب اہلِ جنت اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے تو اس کے بعد دربارِ خداوندی کا آغاز اس طرح ہوگا کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام (جنھوں نے قیامت کا صور پھونکا تھا) سے اللہ تعالیٰ ایسے لحن میں اپنا کلام اور نغمہ سنوائیں گے کہ ساری دنیا کے لحن اور موسیقیاں اس کے سامنے

ہیچ اور کمتر ہوں گی[1]۔

مشک وزعفران کی بارش

نغمہ اور کلام سنوانے کے بعد آسمان پر بادل چھا جائیں گے، جیسے گھٹا آ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوگا کہ اب بارش ہونے والی ہے، لوگ ان بادلوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اتنے میں تمام اہلِ دربار کے اوپر مشک اور زعفران کا چھڑکاؤ ان بادلوں سے کیا جائے گا، اس کے نتیجے میں خوشبو سے پورا دربار مہک جائے گا، وہ خوشبو ایسی ہوگی کہ اس سے پہلے نہ کسی نے سونگھی ہوگی اور نہ اس کا تصور کیا ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ہوا چلے گی، اس ہوا کے چلنے کے نتیجے میں ہر انسان کو ایسی فرحت اور نشاط حاصل ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کا حسن وجمال دوبالا ہوجائے گا، اس کی صورت اور اس کا سراپا پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت ہوجائے گا، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا مشروب تمام حاضرین کو پلایا جائے گا، وہ مشروب ایسا ہوگا کہ دنیا کے کسی مشروب سے اس کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

جنت کی سب سے عظیم نعمت ”اللہ تعالیٰ کا دیدار“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھیں گے اے جنت والو! یہ بتاؤ کہ دنیا میں جو ہم نے تم سے وعدے کیے تھے کہ تمارے اعمالِ صالحہ اور ایمان کے بدلے میں ہم

(۱) حوالہ سابقہ۔

تمہیں فلاں فلاں نعمتیں دیں گے، کیا وہ ساری نعمتیں تمہیں مل گئیں یا کچھ نعمتیں باقی ہیں؟ تو سارے اہلِ جنت بیک زبان ہوکر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ان سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی جو آپ نے ہمیں عطا فرمادی ہیں، آپ نے تو سارے وعدے پورے فرمادیے، ہمارے تمام اعمال کا بدلہ ہم کو مل گیا، ساری نعمتیں ہم کو عطا فرمادیں، اب اس کے بعد ہمیں کسی نعمت کی خواہش نظر نہیں آتی، ساری راحتیں حاصل ہوگئیں، ساری لذتیں حاصل ہوگئیں، اب اور کیا نعمت باقی ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہاری ایک نعمت باقی ہے، اب تمہیں اس نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ تمام اہلِ جنت کو دکھائیں گے، جلوہ دیکھنے کے بعد ہر جنتی یہ محسوس کرے گا کہ ساری نعمتیں جو اس سے پہلے دی گئی تھیں وہ اس عظیم نعمت کے آگے ہیچ در ہیچ ہیں، اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ دیدار کی نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد اس دربار کا اختتام ہوگا اور پھر تمام اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس چلے جائیں گے(۱)۔

حسن وجمال میں اضافہ

جب وہ اہلِ جنت اپنے ٹھکانوں پر واپس پہنچیں گے تو ان کی بیویاں اور حوریں ان سے کہیں گی کہ آج کیا بات ہوئی کہ تمہارا حسن وجمال پہلے سے کہیں زیادہ ہوچکا ہے، آج تو تم بہت حسین وجمیل بن کر لوٹے ہو۔ جواب میں اہلِ جنت اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ ہم تمہیں جس حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، تم

---

(۱) صحیح البخاری ۸/۱۱۴ (٦٥٤٩) وصحیح مسلم ٤/۲۱۷٦ (۲۸۲۹)۔

اس سے کہیں زیادہ حسین وجمیل اور خوبصورت نظر آرہی ہو۔ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں کے حسن وجمال میں اضافہ اس خوشگوار ہوا کے بدولت ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے چلائی تھی۔ (۱)

بہر حال! یہ جنت میں جمعہ کے دن کے اجتماع اور دربارِ خداوندی کی ایک چھوٹی سی منظر کشی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اس کا کچھ حصہ عطا فرمادے۔ آمین۔

جنت کی نعمتوں کا تصور نہیں کرسکتا

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کوئی بھی لفظ اور کوئی بھی تعبیر اور کوئی بھی منظر کشی جنت کے حالات کا صحیح منظر نہیں کھینچ سکتی۔ اس لیے کہ ایک حدیث قدسی میں خود اللہ جل شانہ نے فرمایا:

"أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ" (۲)

---

(۱) مسند البزار ۲۸۸/۷ (۲۸۸۱) وصفة الجنة لابن ابی الدنيا ص ۲۲۲ (۳۳۳) كلاهما من حديث حذيفة بن اليمان. والحديث ذكره الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۴۲۲/۱۰ (۱۸۷۷۲) وقال: رواه البزار، وفيه القاسم بن مطيب، وهو متروك۔ وله شاهد من حديث انس بن مالك عند البزار ۶۸/۱۴ (۷۵۲۷) وابی يعلی ۲۲۸/۷ (۴۲۲۸) وغيرهما من حديث انس بن مالك. والحديث ذكره الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۴۲۱/۱۰ (۱۸۷۷۱) رواه البزار، والطبرانی فی الاوسط بنحوه، وابو يعلی باختصار، ورجال ابی يعلی رجال الصحيح، واحد اسنادی الطبرانی رجاله رجال الصحيح، غير عبد الرحمن بن ثابت بن ثوبان، وقد وثقه غير واحد، وضعفه غيرهم، واسناد البزار فيه خلاف۔

(۲) صحيح البخاری ۱۱۸/۴ (۳۲۴۴) وصحيح مسلم ۲۱۷۴/۴ (۲۸۲۴)۔

یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو آج تک کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور کسی دل میں ان کا خیال بھی نہیں گزرا۔

اس لیے علماءِ کرام نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں کے نام تو دنیا کی نعمتوں جیسے ہیں، مثلاً وہاں پر طرح طرح کے پھل ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوگی، لیکن ان کی حقیقت ایسی ہوگی کہ آج ہم دنیا میں اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کیسی کھجور ہوگی، کیسا انار ہوگا اور کیسے انگور ہوں گے، ان کی حقیقت کچھ اور ہوگی۔

روایت میں آتا ہے کہ جنت میں محلات ہوں گے [1]۔ اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جیسے محلات ہوتے ہیں ایسے محلات ہوں گے، لیکن حقیقت میں یہاں بیٹھ کر ان محلات کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ شراب، دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی [2]۔ اب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا کے دودھ اور شہد کی طرح ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتی، حالانکہ وہاں کے شہد، شراب اور دودھ کا ہم یہاں بیٹھ کر تصور ہی نہیں کر سکتے۔

---

(۱) قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ سورۃ الزمر آیت (۲۱)

(۲) قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ سورۃ محمد آیت (۱۵)

جنت میں خوف اور غم نہیں ہوگا

جنت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت جو دنیا کے اندر ہمارے لیے ناقابلِ تصور ہے اور وہ دنیا میں کسی انسان کے تصور میں آ ہی نہیں سکتی، وہ یہ ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا نہ حزن اور غم ہوگا، وہاں نہ ماضی کا غم ہوگا نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا۔ یہ وہ نعمت ہے جو دنیا میں کبھی کسی کو میسر آ ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ یہ عالمِ دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہاں کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں۔ پھر ہر خوشی کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم ضرور لٹکا ہوا ہے، ہر لذت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تلخی ضرور لگی ہوئی ہے، مثلاً آپ کھانا کھا رہے ہیں، کھانا بڑا لذیذ ہے، کھانے میں بڑا مزہ آ رہا ہے، لیکن یہ اندیشہ لگا ہوا ہے، کہ اگر زیادہ کھا لیا تو بدہضمی ہو جائے گی یا مثلا آپ کوئی مشروب پی رہے ہیں، بڑا اچھا لگ رہا ہے، لیکن ساتھ یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ پی لیا تو کہیں پھندا نہ لگ جائے، کسی نہ کسی تکلیف کا، کسی نہ کسی رنج کا، کسی نہ کسی غم کا اندیشہ ضرور لگا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جنت کے عالم کو ہر اندیشے، ہر غم، ہر تکلیف سے خالی بنایا ہے، وہاں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا، کوئی غم نہیں ہوگا، وہاں پر نہ ماضی کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا، وہاں کسی خواہش کے پورے نہ ہونے کی حسرت نہیں ہوگی، بلکہ جو خواہش ہوگی وہ پوری ہوگی۔

جنت کی نعمتوں کی دنیا میں جھلک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہلِ جنت کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے

گا،(۱) مثلاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں انار کا رس پیوں۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں انار توڑ کر اس کا جوس نکالنا پڑے گا، بلکہ انار کا جوس خود تمہارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنت کی نعمتوں کی تھوڑی تھوڑی جھلکیاں دنیا کے اندر بھی دکھائی ہیں، پہلے جب جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا تو لوگ ان کو بہت عجیب ناقابلِ یقین سمجھتے تھے کہ یہ طلسماتی باتیں ہیں اور ان باتوں پر یقین کرنے میں لوگوں کو تامل ہوتا تھا، لیکن آج اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ جب انسان نے اپنی محدود سے محدود عقل اور تجربے کے بل بوتے پر ایسے کام کر دکھائے کہ اگر سو سال پہلے ان کاموں کے بارے میں لوگوں کو بتادیا جاتا تو لوگ پاگل اور دیوانہ کہتے سو سال تو دور کی بات ہے، مثلاً اگر آج سے صرف بیس سال پہلے یہ کہا جاتا کہ ایک ایسا آلہ ایجاد ہونے والا ہے جو ایک منٹ میں تمہارے خط کو امریکہ اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دے گا تو خبر دینے والے کو پاگل کہا جاتا کہ پاکستان کہاں اور امریکہ کہاں، اگر ہوائی جہاز سے بھی جائے تب بھی کم از کم بیس بائیس گھنٹے لگیں گے، ایک منٹ میں خط کیسے پہنچ جائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فیکس مشین اور ٹیلکس مشین کی ایجاد کے ذریعے دکھا دیا، یہاں فیکس مشین میں خط ڈالا اور وہاں اس کی کاپی اسی وقت نکل آئی۔ اس محدود عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آلات ایجاد کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ جب یہ محدود انسان اپنی محدود عقل کے بل بوتے پر ایسے ایسے کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اور اپنی رحمتِ کاملہ سے اپنے بندوں

---

(۱) قرآن کریم میں ارشاد پاک ہے کہ ﴿وَ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ سورۃ الزخرف آیت (۷۱) نیز ملاحظہ ہو امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ کی کتاب "صفة الجنة" ص ۱۰۸ (۱۰۹) طبع مكتبة ابن تيمية.

کے لیے ایسے اسباب مہیا نہیں فرما سکتے کہ اِدھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور اُدھر وہ خواہش پوری ہو جائے۔

یہ جنت متقین کے لیے ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب تک انسان کے سامنے حقائق نہیں آتے، اس وقت تک وہ اعلیٰ درجے کی چیزوں کو ناقابلِ یقین تصور کرتا ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم عطا فرمایا جو دنیا کے کسی بھی انسان کو عطا نہیں کیا گیا، انہوں نے ہمیں جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں یقینی خبریں دی ہیں کہ اس سے زیادہ یقینی خبریں اور کوئی نہیں ہوسکتیں۔ لٰہذا یہ ساری خبریں سچی ہیں اور ہزار درجہ سچی ہیں اور جنت حق ہے، اس کی نعمتیں حق ہیں، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱)

اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے اور یہ جنت متقین کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہوں۔

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۳۳)۔

جنت کے گرد ''کانٹوں'' کی باڑ

بہر حال! یہ جنت جو عظیم الشان ہے اور جس کی نعمتیں عظیم الشان ہیں، لیکن اسی جنت کے بارے میں ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ''(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہوا ہے جو ظاہری طور پر انسان کے نفس پر شاق اور ناگوار ہوتی ہیں۔ جیسے ایک بہت عالی شان محل ہے، لیکن اس محل کے اردگرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، اس محل میں داخل ہونے کے لیے کانٹوں کی باڑ کو عبور کرنا ہی پڑے گا اور جب تک کانٹوں کی اس باڑ کو پار نہیں کرو گے اس محل کی لذتیں اور نعمتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالی شان جنت کے گرد ان چیزوں کی باڑ لگائی ہے جو انسان کے نفس پر شاق گزرتی ہیں، مثلاً فرائض وواجبات لازم کردیے کہ یہ فرائض انجام دو۔ اب آدمی کے نفس پر یہ بات شاق گزرتی ہے کہ اپنے سب کام چھوڑ کر مسجد جائے اور مسجد میں جاکر نماز ادا کرے۔ اسی طرح بہت سے کام جن کے کرنے کو انسان کا دل چاہتا ہے، لیکن ان کو حرام اور گناہ قرار دے دیا گیا۔ مثلاً یہ حکم دے دیا گیا کہ اس نگاہ کی حفاظت کرو، یہ نگاہ غلط جگہ پر نہ پڑے، نامحرم پر نہ پڑے اور یہ نگاہ غلط اور ناجائز پروگرام نہ دیکھے۔ ان سب کاموں سے رکنا انسان پر شاق گزرتا ہے، اب اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ یہ کام کرے، لیکن اس کو روک دیا گیا۔ یہی کانٹوں کی باڑ ہے جو جنت کے گرد لگی ہوئی ہے۔ یا مثلاً مجلس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کا ذکر آگیا، اب دل چاہ رہا ہے کہ اس کی خوب غیبت

---

(۱) صحیح مسلم ۲۱۷۴/۴ (۲۸۲۲) وسنن الترمذی ۳۱۹/۴ (۲۵۵۹)۔

کریں، لیکن یہ حکم دے دیا گیا کہ نہیں، غیبت مت کرو، اپنی زبان روک لو، یہ ہے کانٹوں کی باڑ۔ اگر جنت کو حاصل کرنا ہے تو کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرنا ہوگا، اس کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔

دوزخ کے گرد شہوات کی باڑ

اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

"وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ"(۱)

یعنی دوزخ کے گرد اللہ تعالیٰ نے شہوات کی باڑ لگادی ہے، دوزخ کو بڑی خوشنما چیزوں اور دلکش خواہشات نے گھیر رکھا ہے، دل ان کی طرف بھاگنے کو چاہتا ہے، لیکن اس کے اندر آگ ہی آگ ہے۔

یہ کانٹوں کی باڑ بھی پھول بن جاتی ہے

بہر حال! اس جنت کے گرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، لیکن یہ کانٹے بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمت اور عزم کرلے کہ مجھے کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرنی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان کانٹوں کو بھی پھول بنادیتے ہیں۔ یہ کانٹے اس وقت تک کانٹے ہیں جب تک ان کو دور دور سے دیکھو گے اور جب تک ان کا تصور کرتے رہوگے تو یہ کانٹے ہیں اور ان کا عبور کرنا مشکل نظر آئے گا، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ کر اور ہمت کر کے ارادہ کرلیا کہ میں تو

---

(۱) حوالہ سابقہ۔

کانٹوں کی یہ باڑ عبور کر کے رہوں گا اور مجھے اس کانٹے کی باڑ کے پیچھے وہ باغ نظر آرہا ہے اور اس کی نعمتیں نظر آرہی ہیں اور مجھے اس کانٹوں کی باڑ کو پار کر کے اس باغ میں جانا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی پھول بنا دیتے ہیں اور اس کو گلزار بنا دیتے ہیں۔

ایک صحابی کا جان دے دینا

ایک صحابی (رضی اللہ عنہ) جہاد میں شریک ہیں، انہوں نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر بڑی طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہا ہے اور اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس وقت بے ساختہ زبان پر جو کلمہ آیا وہ یہ تھا کہ

اَلیوم اَلْقَی الْاَحِبَّهْ   مُحَمَّداً وَّ حِزْبَهْ

یعنی وہ وقت آگیا کہ ہماری ملاقات اپنے محبوبوں اور دوستوں سے ہوگی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے اس عالمِ آخرت میں ملاقات ہوگی(۱)۔

گویا کہ آگ اور خون کا جو کھیل ہو رہا تھا، جس میں لاشیں تڑپ رہی تھیں اور جان دینا جو سب سے زیادہ مشکل نظر آرہا تھا، لیکن وہ صحابی اس جان دینے کی تکلیف کو خوشی خوشی سہنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ کے راستے میں لڑنے والا شہید ہوتا ہے اور اس کو

---

(۱) مسند البزار ۲۴۳/٤ (۱٤۱۰) والطبقات لابن سعد ۲۵۷/۳ طبع دار صادر بیروت۔ والمستدرک للحاکم ٤٤۵/۳ (۵٦۸۷) والحدیث ذکره الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۲۹۷/۹ (۱۵٦۲۵) معزوا إلی الطبرانی، وقال: وإسناده حسن۔

موت آتی ہے تو اس کو موت آنے کی تکلیف اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے[1]۔

یہ درحقیقت جنت تک پہنچنے کے لیے کانٹے کی باڑ حائل تھی جس کو عبور کرنا تھا، لیکن جب عزم کرلیا کہ یہ جان تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اسی کو دینی ہے ؂

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب یہ عزم کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کانٹے کو پھول بنادیا، اگر بستر پر مرتے تو نہ جانے کس طرح ایڑیاں رگڑ کر مرتے، کیا کیا تکلیف اُٹھانی پڑتی، لیکن ہم نے تمہارے لیے قتل ہونے کی تکلیف بھی ایسی بنادی جیسی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔

دنیا والوں کے طعنوں کو قبول کرلو

بہر حال! یہ کانٹے بھی دور دور سے دیکھنے کے کانٹے ہیں، لیکن جب آدمی ایک مرتبہ عزم اور ہمت کرلے اور اس کی طرف چل پڑے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی اس کے لیے پھول بنادیتے ہیں، لہٰذا ہم لوگ جو سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم نے دین کے فلاں حکم پر عمل کرلیا یا فلاں گناہ سے بچ گئے یا فلاں کام کرلیا تو اول نفس کو بڑی مشقت ہوگی، پھر دوسری طرف معاشرے کا خیال آتا

---

(۱) سنن الترمذی ۲۹۸/۳ (۱٦٦۸) وقال: ھذا حدیث حسن صحیح غریب۔ وسنن النسائی ۳٦/٦ (۳۱٦۱) وصحیح ابن حبان ۵۱۲/۱۰ (٤٦۵۵)۔

ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ تو بالکل مولوی ہوگیا، یہ تو پرانے وقت کا آدمی ہوگیا، یہ تو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کو تیار نہیں، اس قسم کے طعنے ملنے کا خیال آتا ہے، یاد رکھو! یہ سب کانٹے ہیں اور جنت تک پہنچنے کے لیے راستے میں جو کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے یہ بھی ان ہی میں سے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ ان کانٹوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرلو گے اور ان سے یہ کہہ دو گے کہ ہاں! ہم مولوی ہیں اور بیک ورڈ ہیں، لیکن ہم ایسے بیک ورڈ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ یہ عزم کرلو گے تو یقین رکھو کہ یہ سب کانٹے تمہارے لیے پھول بن جائیں گے۔

عزت دین پر چلنے والوں کی ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ اس دنیا کے اندر دکھا دیتے ہیں کہ ان طعنہ دینے والے اور الزام عائد کرنے والوں کی زبانیں رک جاتی ہیں اور بالآخر اللہ تعالیٰ عزت ان ہی لوگوں کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ عزت ان ہی کی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع فرمان ہوں۔ عہدِ رسالت میں منافقین بھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو عزت والے ہیں اور مسلمان ذلیل ہیں اور جب مدینہ منورہ جائیں گے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے یعنی مسلمانوں کو۔ چنانچہ یہ منافقین مسلمانوں کو ذلیل ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، ان کو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱)

---

(۱) سورۃ المنافقون آیت (۸)۔

یعنی عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے رسول کے لیے ہے اور مؤمنین کے لیے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے، ان کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں۔

پھر عبادتوں میں لذت آئے گی

تو جنت کے اردگرد کانٹے ضرور ہیں، لیکن یہ آزمائش کے کانٹے ہیں، جب تم اس کے قریب جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ ان ہی کانٹوں کو پھول بنادیں گے اور پھر یہی عبادتیں جو تم پر شاق گزر رہی تھیں، انہی عبادتوں میں وہ لذت حاصل ہوگی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے لذیذ کام میں حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

"قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلَاةِ"(۱)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

یعنی یہ نماز ویسے تو عبادت ہے، لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی لذت عطا فرمائی ہے کہ دنیا کی ساری لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔

گناہ چھوڑنے کی تکلیف

اسی طرح گناہ چھوڑنے میں بے شک مشقت معلوم ہوتی ہے، دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن دل پر آرے چلنے کے باوجود آدمی اللہ کے لیے یہ

(۱) سنن النسائی ۶۱/۷ (۳۹۳۹) و (۳۹۴۰) ومسند احمد ۳۰۵/۱۹ (۱۲۲۹۳) والمستدرک للحاکم ۱۷٤/۲ (۲۶۷۶) وقال: هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه. ووافقه الذهبی فی "التلخیص".

گناہ چھوڑ دے اور یہ کہے کہ میں اپنی ان خواہشات کو اللہ کے آگے قربان کر رہا ہوں تو ابتداء میں ضرور مشقت ہوتی ہے، لیکن بالآخر پھر ان خواہشات کو کچلنے ہی میں مزہ آتا ہے۔ جب بندہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں یہ خواہشات اپنے خالق اور مالک کے لیے کچل رہا ہوں تو پھر اس کو اسی میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

ماں بچے کی تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

دیکھیے! ایک ماں ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ ہے، سردی کی رات ہے اور ماں اپنے بچے کے ساتھ لحاف میں لیٹی ہے، اتنے میں بچے نے پیشاب پاخانہ کر دیا، اب وہ ماں اس گرم و نرم لحاف اور بستر کو چھوڑ کر اس بچے کے کپڑے بدل رہی ہے، اس کا بستر اور کپڑے ٹھنڈے پانی سے دھو رہی ہے، اب اس وقت میں اپنی نیند خراب کر کے ٹھنڈے پانی سے یہ کام کرنا کتنا مشکل کام ہے، لیکن وہ ماں یہ سب کام کرتی ہے اور اس کو اس کام میں مشقت بھی ہوتی ہے، لیکن جب وہ یہ تصور کرتی ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کے لیے کر رہی ہوں، اپنے جگر کے ٹکڑے کے لیے کر رہی ہوں تو اس مشقت ہی میں اس کو لطف اور مزہ آنے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس خاتون سے کہے کہ تجھے بڑی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، راتوں کو اُٹھنا پڑتا ہے، سردی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر تیرا یہ بچہ تجھ سے چھن جائے تو تیری یہ مشقتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں تو خاتون یہ کہے گی کہ اس مشقت سے ہزار گنا مشقت اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں، لیکن میرا بچہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ کیوں ایسا کہے گی؟ اس لیے کہ اس خاتون کو اس بچے سے محبت ہے اور اس کی محبت کی خاطر سخت سے سخت کام کرنے کو نہ صرف تیار ہے، بلکہ اس کو اسی مشقت اور تکلیف میں مزہ آتا ہے۔ بالکل اسی

طرح جب ایک بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوجاتی ہے، تو پھر اللہ کی راہ میں اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنے میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو خواہشات کے پورا کرنے میں حاصل نہیں ہوتی۔

جنت اور عالمِ آخرت کا مراقبہ کریں

بہر حال! جنت کی یہ نعمتیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں اور سارا قرآنِ کریم ان نعمتوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، یہ اس لیے بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرے جو اس جنت کے اردگرد لگی ہوئی ہے۔ اس کے لیے بزرگوں نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں رہ کر انسان جنت کی ان نعمتوں کا کبھی کبھی تصور اور دھیان کیا کرے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مواعظ میں فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر عالمِ آخرت کا تصور کرے اور خاص طور پر جنت کی نعمتوں کا تصور کیا کرے اور یہ مراقبہ کرے کہ میں دنیا سے جا رہا ہوں، قبر میں رکھ دیا گیا ہوں، لوگ مجھے دفن کر کے رخصت ہوگئے ہیں، پھر عالمِ برزخ میں پہنچ گیا، پھر عالمِ آخرت شروع ہوگیا، یہاں حساب وکتاب ہو رہا ہے، میزان لگی ہوئی ہے، پلِ صراط لگا ہوا ہے، ایک طرف جنت ہے، دوسری طرف جہنم ہے اور پھر جنت کے اندر یہ نعمتیں ہیں اور جہنم کے اندر اس طرح کے عذاب ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر بیٹھ کر ان تمام چیزوں کا تصور اور دھیان کیا کرے اس لیے کہ ہم صبح سے شام تک دنیا کی زندگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس

عالمِ آخرت سے غافل ہوگئے ہیں۔ الحمد للہ! ہم سب کا یہ عقیدہ ہے اور اس پر یقین ہے کہ اس دنیا سے ایک دن جانا ہے اور آخرت آنے والی ہے، لیکن تنہا عقیدہ اور یقین کافی نہیں، بلکہ اس کا استحضار بھی ضروری ہے اور اس کا دھیان بھی ضروری ہے، یہ دھیان اور استحضار ہی انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے، معصیت اور گناہ سے روکتا ہے۔ اس وجہ سے تھوڑا وقت نکال کر آخرت کا دھیان اور مراقبہ کرو، اس دھیان اور مراقبہ کے نتیجے میں ان شاء اللہ آخرت کا استحضار پیدا ہوگا۔

دنیا کے کاموں کے اندر آخرت کا دھیان اور استحضار تمہیں اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرے گا اور معصیت اور گناہ سے بچنے میں مدد دے گا۔ جنت کی ان نعمتوں کے بیان کرنے کا یہی مقصود ہے جو قرآن وحدیث میں بھری ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت کی نعمتوں کا استحضار عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ
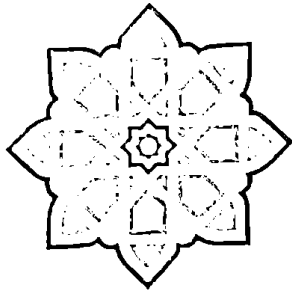
آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت

(نشری تقریریں ص ۱۰۵)
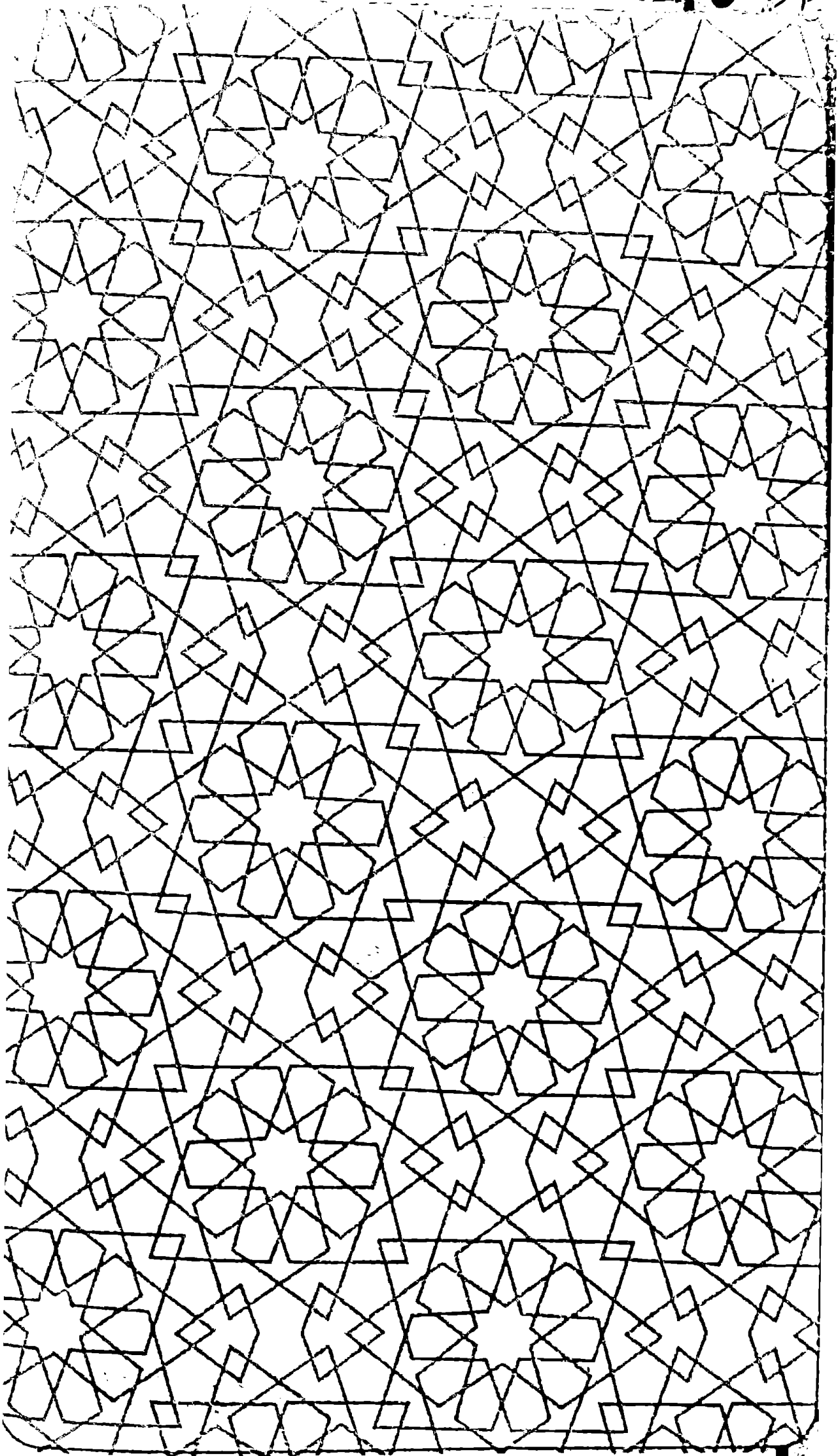
بسم اللہ الرحمن الرحیم

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت
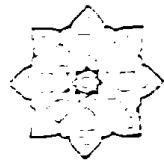
نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

عن المستورد بن شداد قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلّم يقول: "و الله ما الدنيا فى الآخرة الا مثل ما يجعل احدكم اصبعه فى اليم فلينظر بم يرجع" (۱)

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بس ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی ایک انگلی سمندر میں ڈال کر نکال لے اور پھر دیکھے کہ اس میں کتنا پانی لگ کر آیا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲۱۹۳/٤ (۲۸۵۸)۔

اس حدیث سے آنحضرت ﷺ کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ آخرت سے مقابلے میں دنیا بالکل بے حقیقت اور بے حیثیت چیز ہے۔ احادیث میں رسولِ کریم ﷺ سے ایسے بے شمار ارشادات مروی ہیں جن میں آپ ﷺ نے دنیا کی بے ثباتی اور اس کی حقارت بیان فرمائی ہے تاکہ سننے والوں کے دل میں دنیا کی طرف سے بے رغبتی پیدا ہو، ان تمام احادیث کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام نے رہبانیت یا ترکِ دنیا کی تعلیم کبھی نہیں دی، [1] بلکہ دنیوی ضروریات کو صحیح طریقے سے پورا کرنا نہ صرف جائز، بلکہ واجب قرار دیا ہے، [2] لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی محبت اور حرص دل میں پیدا کرنے سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح یہ دنیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں ایک حقیقت ہے، اسی طرح آخرت کی زندگی بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس کی خبر تمام انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ آخرت کی زندگی ہماری نظروں سے اوجھل ضرور ہے، لیکن اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ اس پیٹ ہی کو ساری کائنات سمجھتا ہے اور دنیا اس کے سامنے نہیں ہوتی، جس طرح اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ

---

(۱) ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق ۸/۴۴۸ (۱۵۸۶۰)

(۲) صحیح البخاری ۳/۳۸ (۱۹۶۸) حیث جاء فیه: "إن لربك عليك حقًا ولنفسك عليك حقًا ولأهلك عليك حقًا فأعط كل ذي حق حقه" وأخرج أبو نعيم في "حلية الأولياء" ۷/۱۲۶ عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول ﷺ "كسب الحلال فريضة بعد الفريضة".

کوئی حقیقت نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی نہایت محدود اور آخرت کی زندگی لا محدود ہے اور دنیا کی زندگی کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعے اپنی اخروی مستقبل کی تعمیر کی جائے۔

لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ دنیا چونکہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور آخرت آنکھوں سے اوجھل ہے، اس لیے آخرت پر ایمان رکھنے والوں پر بھی دنیا ہی کی فکر غالب ہو جاتی ہے، ان کی ساری جد و جہد، تمام تر تگ و دو اور سوچ بچار کی پوری توانائی دنیا ہی کے مقاصد پر صرف ہوتی ہے،اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی کما حقہ فکر باقی نہیں رہتی،اور انسان دنیوی خوشحالی کے شوق میں اپنی آخرت برباد کر ڈالتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے چھوٹے بچوں کی تمام تر دلچسپی عام طور سے کھیل کھلونوں اور سیر و تفریح پر مرکوز رہتی ہے اور وہ تعلیمی اور تربیتی مشاغل جو اس کے مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں ان کے لیے عموماً غیر دلچسپ، بلکہ ناگوار ہوتے ہیں، لیکن مشفق ماں باپ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھا بجھا کر ان پر کھیل کھلونوں اور تعلیم و تربیت کا حقیقی فرق واضح کریں اور یہ بتائیں کہ یہ کھیل کھلونے انجام کے لحاظ سے تعلیم کے مقابلے میں قطعی بے حقیقت ہیں۔

بس اسی طرح انبیاء علیہم السلام جو انسانوں کے لیے ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہوتے ہیں، اپنے متبعین کے سامنے مختلف مثالوں اور مختلف انداز سے دنیا اور آخرت کی حقیقت واضح کرتے رہتے ہیں، تاکہ وہ دنیا کے مشاغل میں الجھ کر آخرت سے غافل نہ ہو جائیں، اسی مقصد کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مثال دی ہے کہ جس طرح ایک ناپیدا کنار سمندر کے مقابلے میں انگلی پر لگا ہوا پانی

بالکل بے حقیقت اور بے حیثیت چیز ہے اور اسے سمندر سے کوئی نسبت نہیں، اسی طرح آخرت کے مقابلے میں دنیا بھی بالکل بے حقیقت ہے، کیونکہ یہ دنیا کی زندگی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر سال اور بہت ہوئی تو اسی نوے سال میں ختم ہوجاتی ہے، لیکن آخرت کی زندگی لامحدود ہے، اس کی کوئی انتہاء نہیں، لہٰذا دنیا میں رہتے ہوئے تمہارے لیے تمام جائز اسبابِ زندگی سے استفادہ جائز ہے، لیکن ان اسبابِ زندگی میں محو ہوکر آخرت کو فراموش کر دینا اور اس کی فکر سے غافل ہوجانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے پڑھنے لکھنے کا سارا زمانہ کھیل کود ہی میں گزار دے اور وہ اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی کوئی فکر نہ کرے، بلکہ یہ شخص تو جوں توں کر کے زندگی گزار ہی لے گا، آخرت کو بھول جانے والے کا انجام اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ دنیا سے جانے کے بعد یہاں کی بدعملی کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا اور آخرت دونوں کے حقوق ٹھیک انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
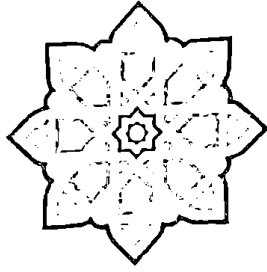
موت کی حقیقت
(۱)

دنیا کے اس پار

(ذکر و فکر ص ۳۲۵)
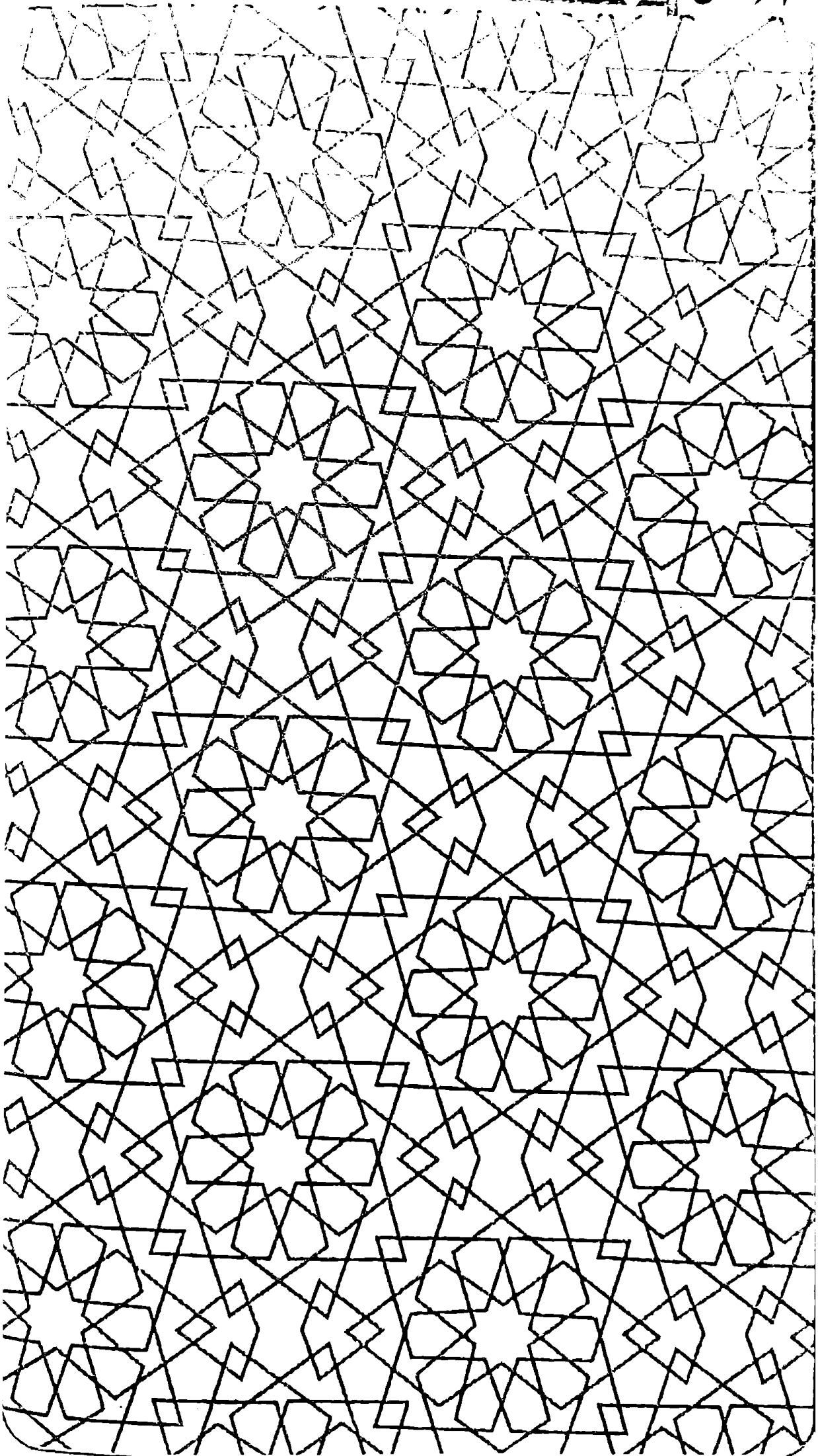
بسم اللہ الرحمن الرحیم

موت کی حقیقت (۱)
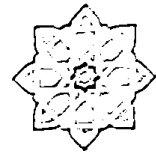
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا قطعی اور یقینی جواب صرف قرآنِ کریم اور متواتر احادیث ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ آج کوئی بھی شخص اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، اس لیے کہ جو شخص واقعتاً موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے وہ پلٹ کر یہاں نہیں آتا ؏

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

لیکن چند سال پہلے ایک کتاب میرے مطالعے میں آئی جس میں کچھ ایسے لوگوں کے دلچسپ تجربات و مشاہدات جمع کیے گئے ہیں جو موت کی دہلیز تک پہنچ کر واپس آگئے، اور انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ انہوں نے موت کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھا؟ کتاب کا نام ہے Life after life (زندگی کے بعد کی زندگی) اور یہ ایک امریکی ڈاکٹر ریمنڈ اے مودی (Raymond a. Moodi) کی لکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مودی اصلاً فلسفے کے پی ایچ ڈی ہیں پھر انہوں نے میڈیکل سائنس کے مختلف شعبوں میں کام کیا ہے، بالخصوص نفسیات

اور فلسفہ ادویہ سے انہیں خصوصی شغف ہے۔ ان صاحب کو سب سے پہلے ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر جارج رچی کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈبل نمونیا کے دوران ایک مرحلے پر وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گئے اور پھر ڈاکٹروں نے مصنوعی تنفس وغیرہ کے آخری طریقے (Resuscitation) استعمال کیے، جن کے بعد وہ واپس آئے اور صحت مند ہو گئے، صحت مند ہونے کے بعد انہوں بتایا کہ جب انہیں مردہ سمجھ لیا گیا تھا، اس وقت انہوں نے کچھ عجیب وغریب مناظر کا مشاہدہ کیا۔ ڈاکٹر مودی کو اس کے چند مزید واقعات علم میں آئے، تو انہوں نے اہمیت کے ساتھ ایسے لوگوں کی جستجو اور ملاقاتیں شروع کیں، یہاں تک کہ تقریباً ڈیڑھ سو افراد سے انٹرویو کے بعد انہوں نے یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو اس کی تیس لاکھ کاپیاں ایک ہی سال میں فروخت ہو گئیں۔ ڈاکٹر مودی نے اس کے بعد بھی اس مسئلے کی مزید تفتیش جاری رکھی اور اس کے بعد اس موضوع پر مزید کئی کتابیں لکھیں، ان میں سے تین کتابیں میں تین چار سال پہلے امریکہ سے خرید لایا تھا، ان کے نام یہ ہیں:

1. Life after Life
2. The Light Beyond
3. Reflaction on Life after Life

اور جو کچھ میں آگے بیان کر رہا ہوں، وہ ان تینوں کتابوں سے ماخوذ ہیں، ان تینوں کتابوں میں صرف ان لوگوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں جنہیں بیماری کی انتہائی شدت میں مردہ (Clinically dead) قرار دے دیا گیا، لیکن ایسی حالت میں آخری چارۂ کار کے طور پر ڈاکٹر صاحبان دل کی مالش اور مصنوعی

تنفس دلانے کی جو کوشش کرتے ہیں، وہ ان پر کامیابی سے آزمائی گئیں، اور وہ واپس ہوش میں آ گئے۔ ڈاکٹر مودی کا کہنا ہے کہ جن لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کیا وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف جگہوں کے باشندے تھے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی نظر آنے والی کیفیت کو اپنے اپنے طریق پر بیان کیا، کسی نے کوئی بات زیادہ کہی، کسی نے کوئی بات کم بتائی، لیکن بحیثیتِ مجموعی جو مشترک باتیں (Common Elements) ان میں سے تقریباً ہر شخص کے بیان میں موجود تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

> ایک شخص مرنے کے قریب ہے، اس کی جسمانی حالت ایسی حد پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ خود سنتا ہے کہ اس کے ڈاکٹر نے اس کے مردہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اچانک اسے ایک تکلیف دہ سا شور سنائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انتہائی تیز رفتاری سے ایک طویل اور اندھیری سرنگ میں جا رہا ہے، اس کے بعد اچانک وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے جسم سے باہر آ گیا ہے، وہ اپنے ہی جسم کو فاصلے سے ایک تماشائی بن کر دیکھتا ہے، اسے نظر آتا ہے کہ وہ خود کسی نمایاں جگہ پر کھڑا ہے اور اس کا جسم جوں کا توں چارپائی پر ہے اور اس کے ڈاکٹر جسم پر جھکے ہوئے اس کے دل کی مالش کر رہے ہیں، یا مصنوعی تنفس دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

تھوڑی دیر میں وہ اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نئی حالت میں بھی اس کا ایک جسم ہے، لیکن وہ جسم اس جسم سے بالکل مختلف ہے، جو وہ چھوڑ آیا ہے، اس کی کیفیات بھی مختلف ہیں اور اس کو حاصل قوتیں بھی کچھ اور طرح کی ہیں، اسی حالت میں کچھ دیر بعد اسے اپنے وہ عزیز اور دوست نظر آتے ہیں جو مر چکے تھے اور پھر اسے ایک نورانی وجود (being of light) نظر آتا ہے، جو اس سے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی زندگی کا جائزہ لو، اس کا یہ کہنا ماوراءِ الفاظ (non verbal) ہوتا ہے اور پھر وہ خود اس کے سامنے تیزی سے اس کی زندگی کے تمام اہم واقعات لا کر ان کا نظارہ کراتا ہے، ایک مرحلے پر اسے اپنے سامنے کوئی رکاوٹ نظر آتی ہے، جس کے بارے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیوی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی کے درمیان ایک سرحد ہے، اس سرحد کے قریب پہنچ کر اُسے پتا چلتا ہے کہ اسے اب واپس جانا ہے، ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا، اس کے بعد کسی انجانے طریقے پر وہ واپس اپنے اسی جسم میں لوٹ آتا ہے، جو وہ چارپائی پر چھوڑ کر گیا تھا۔

صحت مند ہونے کے بعد وہ اپنی یہ کیفیت دوسروں کو بتانا چاہتا ہے، لیکن اول تو اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے

اسے تمام انسانی الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں، دوسرے اگر
وہ لوگوں کو یہ باتیں بتائے بھی تو وہ مذاق کرنے لگتے ہیں،
لہٰذا وہ خاموش رہتا ہے۔

ڈاکٹر مودی نے ڈیڑھ سو افراد کے انٹرویو کا یہ خلاصہ بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی ہے کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ ڈیڑھ سو افراد میں سے ہر شخص نے یہ پوری کہانی اسی ترتیب کے ساتھ بیان کی، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی نے یہ پوری کہانی بیان کی، کسی نے اس کے کچھ حصے بتائے، کچھ چھوڑ دیے، کسی کی ترتیب کچھ تھی، کسی کی کچھ اور، بلکہ اس بات کو بیان کرنے کے لیے اکثر افراد نے مختلف الفاظ اور مختلف تعبیرات اختیار کیں اور یہ بات تقریباً ہر شخص نے کہی کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، اسے لفظوں میں تعبیر کرنا ہمارے لیے سخت مشکل ہے۔ ایک خاتون نے اپنی اسی مشکل کو قدرے فلسفیانہ زبان میں اس طرح تعبیر کیا:

میں جب آپ کو یہ سب کچھ بتانا چاہتی ہوں تو میرا ایک حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ جتنے الفاظ مجھے معلوم ہیں، وہ سب سہ ابعادی (Three-dimensional) ہیں، (یعنی طول، عرض، عمق کے تصورات میں مقید ہیں) میں نے اب تک جیومیٹری میں یہی پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین بعد ہیں، لیکن جو کچھ میں نے (مردہ قرار دیے جانے کے بعد) دیکھا اس سے پتا چلا کہ یہاں تین سے زیادہ ابعاد ہیں، اسی لیے اس کیفیت کو ٹھیک بتانا میرے لیے بہت مشکل ہے،

کیونکہ مجھے اپنے ان مشاہدات کو سہ ابعادی الفاظ میں بیان
کرنا پڑ رہا ہے۔

بہر کیف! ان مختلف افراد نے جو کیفیات بیان کی ہیں، ان میں سے چند بطورِ خاص اہمیت رکھتی ہیں:

① تاریک سرنگ۔
② جسم سے علیحدگی۔
③ مرے ہوئے رشتے داروں اور دوستوں کو دیکھنا۔
④ ایک نورانی وجود۔
⑤ اپنے زندگی کے گزرے ہوئے واقعات کا نظارہ۔

ان تمام باتوں کی جو تفصیل مختلف افراد نے بیان کی ہے، اس کے چند اقتباسات دلچسپی کا باعث ہوں گے:

تاریک سرنگ سے گزرنے کے تجربے کو کسی نے یوں تعبیر کیا ہے کہ میں ایک تاریک خلا میں تیر رہا ہوں، کسی نے کہا کہ یہ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور میں اس میں نیچے بیٹھتا جا رہا تھا، کسی نے اسے ایک کنویں سے تعبیر کیا ہے، کسی نے اسے اندھیرے غار کا نام دیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ وہ ایک تاریک وادی تھی، کوئی کہتا ہے کہ میں اندھیرے میں اوپر اٹھتا چلا گیا، مگر یہ بات سب نے کہی ہے کہ یہ الفاظ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

جس مشاہدہ کو تمام افراد نے بڑی حیرت کے ساتھ بیان کیا، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے جسم سے الگ ہو گئے، ایک خاتون جو دل کے دورے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھیں، بیان کرتی ہیں کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل دھڑکنا

بند ہو گیا ہے اور میں اپنے جسم سے پھسل کر باہر نکل رہی ہوں، پہلے میں فرش پر پہنچی، پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی، یہاں تک کہ میں ایک کاغذ کے پرزے کی طرح اڑتی ہوئی چھت سے جا لگی، وہاں سے میں صاف دیکھ رہی تھی کہ میرا جسم نیچے بستر پر پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹر اور نرسیں اس پر اپنی آخری تدبیریں آزما رہے ہیں۔ ایک نرس نے کہا: اوہ خدایا! یہ تو گئی اور دوسری نرس نے میرے جسم کے منہ سے منہ لگا کر اسے سانس دلانے کی کوشش کی، مجھے اس نرس کی گدی پیچھے سے نظر آ رہی تھی اور اس کے بال مجھے اب تک یاد ہیں، پھر وہ ایک مشین لائے جس نے میرے سینے کو جھٹکے دیے اور میں اپنے جسم کو اچھلتا دیکھتی رہی۔

جسم سے باہر آنے کی اس حالت کو بعض افراد نے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ ہم ایک نئے وجود میں آ گئے تھے جو جسم نہیں تھا اور بعض نے کہا ہے کہ وہ بھی ایک دوسری قسم کا جسم تھا جو دوسروں کو دیکھ سکتا تھا، مگر دوسرے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس حالت میں بعض افراد نے نظر آنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرنے کی بھی کوشش کی، مگر وہ ان کی آواز نہ سن سکے، یہ بات بھی بہت سے افراد نے بتائی کہ وہ ایک بے وزنی کی کیفیت تھی اور ہم اس بے وزنی کی حالت میں نہ صرف فضا میں تیرتے رہے، بلکہ اگر ہم نے کسی چیز کو چھونے کی کوشش کی تو ہمارا وجود اس شئے کے آر پار ہو گیا، بہت سوں نے یہ بھی بتایا کہ اس حالت میں وقت ساکت ہو گیا تھا اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہم وقت کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔

اس حالت میں کئی افراد نے اپنے مرے ہوئے عزیزوں دوستوں کو بھی دیکھا اور کچھ لوگوں نے بتایا کی ہم نے بہت سی بھٹکتی ہوئی روحوں کا مشاہدہ کیا،

یہ بھٹکتی ہوئی روحیں انسانی شکل سے ملتی جلتی تھیں، مگر انسانی صورت سے کچھ مختلف بھی تھیں، ایک صاحب نے ان کی کچھ تفصیل اس طرح بتائی:

''ان کا سر نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا، وہ بہت غمگین اور افسردہ نظر آتے تھے، وہ سب آپس میں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست معلوم ہوتے تھے جیسے زنجیروں میں بندھا ہوا کوئی گروہ ہو، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے ان کے پاؤں بھی دیکھے ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا تھے، مگر ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے، وہ بالکل ست تھے اور مٹیالے نظر آتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے خلاء میں چکر لگا رہے ہوں اور انہیں پتا نہیں ہے کہ انہیں کہاں جانا ہے، وہ ایک طرف کو چلنا شروع کرتے، پھر بائیں کو مڑ جاتے، چند قدم چلتے پھر دائیں کو مڑ جاتے اور کسی بھی طرف جاتے، کرتے کچھ نہ تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں ہیں، مگر کس چیز کی تلاش میں؟ مجھے معلوم نہیں، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ خود اپنے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رکھتے کہ وہ کون اور کیا ہیں؟ ان کی کوئی شناخت نہیں تھی، بعض اوقات ایسا بھی محسوس ہوا کہ ان میں سے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا۔''(Reflections P.19)

ڈاکٹر مودی نے جتنے لوگوں کا انٹرویو کیا، ان کی اکثریت نے اپنے اس تجربے کے دوران ایک نورانی وجود(Bieng of Light) کا بھی ضرور ذکر کیا

ہے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ اسے دیکھ کر یہ بات تو یقینی معلوم ہوتی تھی کہ وہ کوئی وجود ہے، لیکن اس کا کوئی جسم نہیں تھا وہ سراسر روشنی ہی روشنی تھی، ابتداء میں وہ روشنی ہلکی معلوم ہوتی، لیکن رفتہ رفتہ تیز ہوتی چلی جاتی، لیکن اپنی غیر معمولی تابانی کے باوجود اس سے آنکھیں خیرہ نہیں ہوتی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے بتایا کہ اس نورانی وجود نے ان سے کہا کہ تم اپنی زندگی کا جائزہ لو، بعض نے اس کی کچھ اور باتیں بھی نقل کیں، لیکن یہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس نورانی وجود نے جو کچھ کہا، وہ لفظوں اور آواز کے ذریعے نہیں کہا، یعنی اس کے کوئی لفظ انہیں سنائی نہیں دیتے، بلکہ یہ بالکل نرالا اندازِ اظہار تھا، جس کے ذریعے اس کی باتیں خود بخود ہمارے خیالات میں منتقل ہو رہی تھیں۔

جن لوگوں نے اس بے جسمی کی حالت میں ایک نورانی وجود کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر کا کہنا یہ ہے کہ اس نورانی وجود نے ہم سے ہماری سابق زندگی کے بارے میں کچھ سوال کیا۔ سوال کے الفاظ مختلف لوگوں نے مختلف بیان کیے ہیں، مگر مفہوم سب کا تقریبا یہ ہے کہ تمہارے پاس اپنی سابق زندگی میں مجھے دکھانے کے لیے کیا چیز ہے؟

What do you have to show me that you have done with your life?

پھر ان لوگوں کا بیان ہے کہ اس نورانی وجود نے ہماری سابق زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے ہمیں دکھانے شروع کیے، یہ واقعات کس طرح دکھائے گئے؟ اس کی

تفصیل اور زیادہ دلچسپ ہے، لیکن وہ میں ان شاء اللہ اگلے
ہفتے بیان کروں گا اور اسی کے ساتھ ان واقعات کے
بارے میں اپنا تبصرہ بھی۔

۱۲ محرم ۱۴۱۶ھ
۳۰ مئی ۱۹۹۶ء
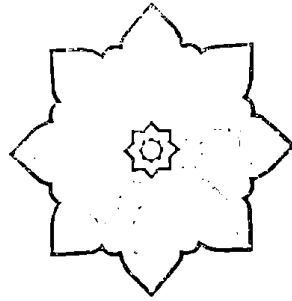
موت کی حقیقت
(۲)

دنیا کے اس پار

(ذکر وفکر ص ۳۳۳)
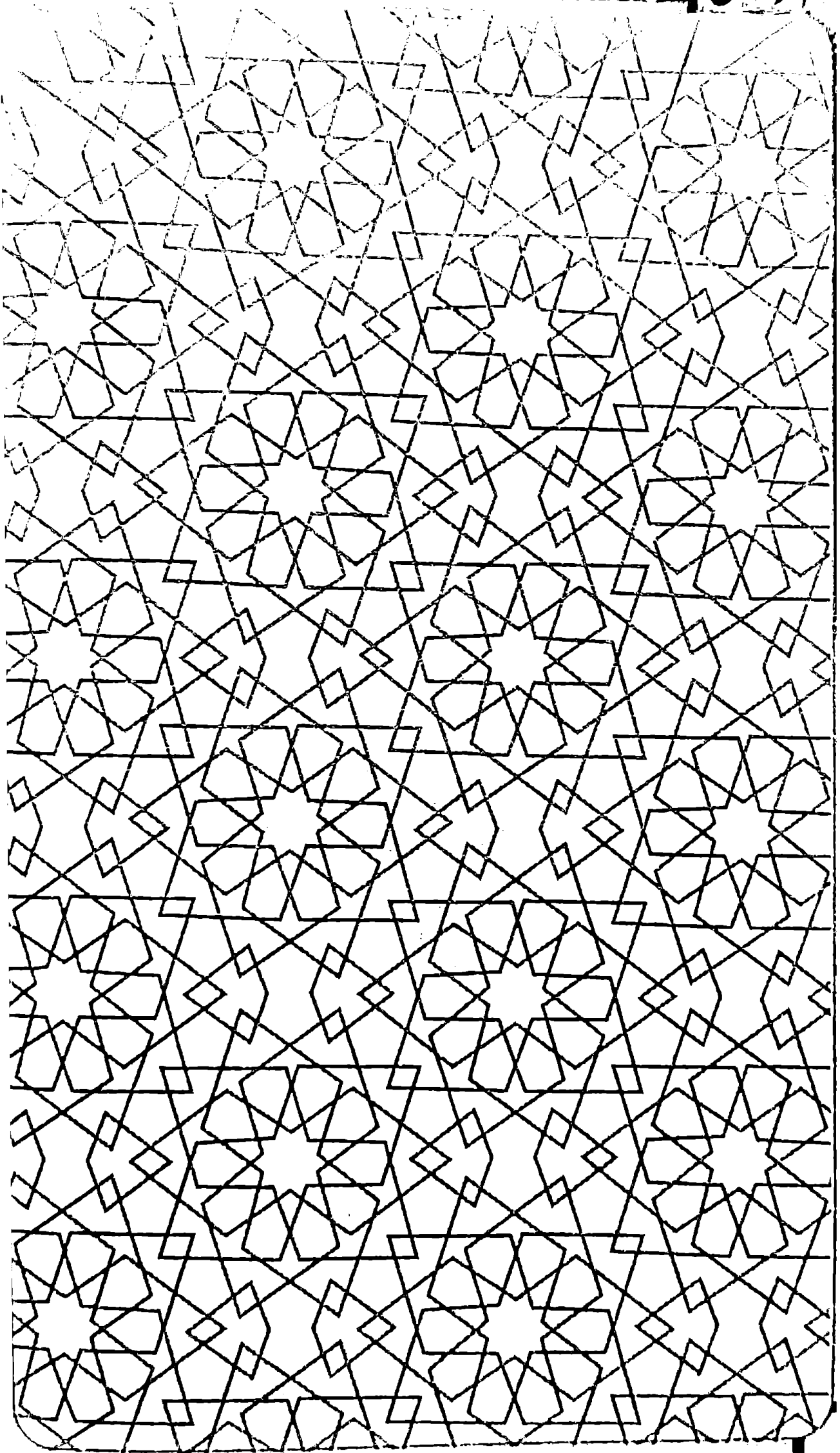
بسم اللہ الرحمن الرحیم

موت کی حقیقت (۲)
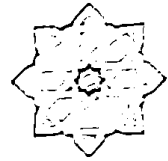
پچھلے ہفتے میں نے امریکہ کے ڈاکٹر ریمنڈ اے مودی کی کتاب کے حوالے سے ان لوگوں کے کچھ تجربات و مشاہدات ذکر کیے تھے جو کسی شدید بیماری یا حادثے کے نتیجے میں موت کے دروازے تک پہنچ کر واپس آ گئے، ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ ایک تاریک سرنگ سے گزرنے کے بعد انہیں ایک عجیب وغریب نورانی وجود نظر آیا، اس نے ہم سے ہماری پچھلی زندگی کے بارے میں سوال کیا اور پھر اس نے پل بھر میں خود ہی ہمیں ہماری زندگی کے سارے واقعات ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ مثلاً ایک خاتون اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> جب مجھے وہ نورانی وجود نظر آیا تو اس نے سب سے پہلے مجھ سے یہ کہا کہ تمہارے پاس اپنی زندگی میں مجھے دکھانے کے لیے کیا ہے؟ اور اس سوال کے ساتھ ساتھ پچھلی زندگی کے نظارے مجھے نظر آنے شروع ہو گئے، میں سخت حیران ہوئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیونکہ اچانک ایسا لگا کہ میں اپنے

بچپن کے بالکل ابتدائی دور میں پہنچ گئی ہوں اور پھر میری آج تک کی زندگی کے ہر سال کا نظارہ ایک ساتھ میرے سامنے آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی ہوں اور اپنے گھر کے قریب ایک چشمے کے پاس کھیل رہی ہوں۔ اسی دور میں بہت سے واقعات جو میری بہن کے ساتھ پیش آئے تھے، مجھے نظر آئے، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات دیکھے، میں اپنے آپ کو کنڈر گارڈن میں نظر آئی، میں نے وہ کھلونا دیکھا جو مجھے بہت پسند تھا، میں نے اسے توڑ دیا تھا اور دیر تک روتی رہتی تھی، پھر میں گرلز سکاؤٹ میں شامل ہوگئی اور گرامر اسکول کے واقعات میرے سامنے آنے لگے، اسی طرح میں جونیر ہائی اسکول اور گریجویشن کے مراحل سے گزرتی رہی، یہاں تک کہ موجودہ دور تک پہنچ گئی۔

تمام واقعات میرے سامنے اسی ترتیب سے آرہے تھے جس ترتیب سے وہ واقع ہوئے اور یہ سب واقعات انتہائی واضح نظر آرہے تھے، مناظر بس اس طرح تھے کہ جیسے تم ذرا باہر نکلو اور انہیں دیکھ لو، سب واقعات مکمل طور پر سہ ابعادی (Three-dimensional) تھے اور رنگ بھی نظر آرہے تھے، ان میں حرکت تھی۔ مثلاً جب میں نے اپنے آپ کو کھلونا توڑتے دیکھا تو میں اس کی

تمام حرکتیں دیکھ سکتی تھی۔

جب مجھے یہ مناظر نظر آ رہے تھے، اس وقت میں اس نورانی وجود کو دیکھ نہیں سکتی تھی، وہ یہ کہتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے؟ اس کے باوجود میرا احساس یہ تھا کہ وہ وہاں موجود ہے اور وہی یہ مناظر دکھا رہا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ خود یہ معلوم کرنا چاہتا ہو، کہ میں نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے؟ وہ پہلے ہی سے یہ ساری باتیں جانتا تھا، لیکن وہ یہ واقعات میرے سامنے لا کر یہ چاہتا تھا کہ میں انہیں یاد کروں۔

یہ پورا قصہ ہی بڑا عجیب تھا، میں وہاں موجود تھی، میں واقعتاً یہ سب مناظر دیکھ رہی تھی اور یہ سارے مناظر انتہائی تیزی سے میرے سامنے آ رہے تھے، مگر تیزی کے باوجود وہ اتنے آہستہ ضرور تھے کہ میں ان کا بخوبی ادراک کر سکتی تھی، پھر بھی وقت کا دورانیہ اتنا زیادہ نہ تھا، مجھے یقین نہیں آتا، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک روشنی آئی اور چلی گئی، ایسا لگتا تھا کہ یہ سب کچھ پانچ منٹ سے بھی کم میں ہو گیا، البتہ غالباً تیس سیکنڈ سے زیادہ وقت لگا ہوگا، لیکن میں آپ کو ٹھیک بتا ہی نہیں سکتی۔

ایک اور صاحب نے اپنے اس مشاہدے کا ذکر اس طرح کیا:

جب میں اس طویل اندھیری جگہ سے گزر گیا تو اس سرنگ

کے آخری سرے پر میرے بچپن کے تمام خیالات، بلکہ میری پوری زندگی مجھے وہاں نظر آئی جو میرے بالکل سامنے روشنی کی طرح چمک رہی تھی، یہ بالکل تصویروں کی طرح نہیں تھی، بلکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ خیالات سے زیادہ ملتی جلتی تھی، میں اس کیفیت کو آپ کے سامنے بیان نہیں کرسکتا، مگر یہ بات طے ہے کہ میری ساری زندگی وہاں موجود تھی، وہ سب واقعات ایک ساتھ وہاں نظر آ رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ ایسا نہیں تھا کہ ایک وقت میں ایک چیز نظر آئے اور دوسرے وقت دوسری، بلکہ ہر چیز بیک وقت نظر آرہی تھی، میں وہ چھوٹے چھوٹے برے کام بھی دیکھ سکتا تھا جو میں نے کیے تھے اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہورہی تھی کہ کاش میں نے یہ کام نہ کیے ہوتے اور کاش میں واپس جا کر ان کاموں کو منسوخ (undo) کرسکتا۔ (Life after Life p.65-69)

جن لوگوں نے اپنے یہ مشاہدات ڈاکٹر مودی کے سامنے بیان کیے، ان میں سے بعض نے یہ بھی بتایا کہ اس مشاہدے کے آخری مرحلے پر انہوں نے کوئی ایسی چیز دیکھی جیسے کوئی رکاوٹ ہو اور یا تو کسی نے کہا یا خود بخود ان کے دل میں خیال آیا کہ ابھی ان کے لیے اس رکاوٹ کو عبور کرنے کا وقت نہیں آیا اور اسی کے بعد وہ دوبارہ اپنے جسم میں واپس آگئے اور معمول کی دنیا کی طرف پلٹ آئے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ رکاوٹ پانی کے ایک جسم کی سی تھی، کسی نے کہا

کہ یہ ایک مٹیالے رنگ کی دھند تھی، کسی نے اسے دروازے سے تعبیر کیا، کسی نے کہا کہ وہ اس طرح کی ایک باڑ تھی جو کھیت کے گرد لگا دی جاتی ہے اور کسی نے یہ بھی کہا کہ وہ صرف ایک لکیر تھی۔

ڈاکٹر مودی کی یہ کتاب Life after Life سب سے پہلے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں انہوں نے آٹھ سال تک تقریباً ڈیڑھ سو افراد سے انٹرویو کے نتائج بیان کیے تھے، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی ان کی یہ ریسرچ نہ پوری طرح سائنٹفک ثبوت کہلانے کی مستحق ہے، نہ وہ اس قسم کے واقعات کے ذمہ دارانہ اعداد وشمار دینے کی پوزیشن میں ہیں، لیکن ان کی اس کتاب نے دوسرے بہت سے ڈاکٹروں کو اس موضوع کی طرف متوجہ کیا اور ان کے بعد بہت سے لوگوں نے اس قسم کے مشاہدات کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر مزید کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک کتاب ڈاکٹر میلون مورس (Melvin Morse) نے لکھی ہے جو Closer To The Light کے نام سے شائع ہوئی ہے، یہ صاحب بچوں کے امراض کے اسپیشلسٹ ہیں اور انہوں نے اس بات کی جستجو شروع کی کہ کیا اس قسم کے مشاہدات بچوں کو بھی پیش آئے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ بالغ لوگ اپنے ذہنی تصورات سے مغلوب ہو کر کچھ نظارے دیکھ سکتے ہیں، لیکن بچے اس قسم کے تصورات سے خالی الذہن ہوتے ہیں، اس لیے اگر ان میں بھی ان مشاہدات کا ثبوت ملے تو ان نظاروں کی واقعی حیثیت مزید پختہ ہو سکتی ہے، چنانچہ اس کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ بہت سے بچوں نے بھی اس قسم کے مشاہدات کیے ہیں اور انہوں نے خود ان بچوں سے ملاقات کر کے ان کے بیانات کو مختلف طریقے سے ٹیسٹ کیا ہے اور ان کا تاثر یہ ہے کہ ان بچوں نے جھوٹ نہیں بولا، بلکہ واقعتاً انہوں نے یہ مناظر دیکھے ہیں، ۲۳۶

صفحات پر مشتمل اسی قسم کے بیانات اور ان کے سائنٹفک تجزیے پر مشتمل ہے۔

ایک اور صاحب پالسٹر جارج گیلپ Pollster George Gallup نے پورے امریکہ میں ایسے لوگوں کا سروے کیا جو اس قسم کے مشاہدات سے گزر چکے تھے، ان کے سروے کا چونکا دینے والا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ کی کل آبادی کے تقریبا پانچ فیصد افراد موت کے قریب پہنچ کر اس قسم کے مشاہدات سے گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مودی نے بھی اپنی تحقیق مزید جاری رکھی اور اپنی دوسری کتاب The Light Beyond میں انہوں نے لکھا ہے کہ پہلے ڈیڑھ سو افراد کے بعد انہوں نے مزید ایک ہزار افراد سے انٹرویو کیا اور اس کے نتائج بھی کم و بیش وہی تھے، البتہ اس دوران بعض افراد نے کچھ نئی باتیں بھی بتائیں۔ مثلاً ڈیڑھ سو افراد میں سے کسی نے صراحتاً جنت یا دوزخ قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن اس نئی تحقیق کے دوران کئی افراد نے صاف صاف دوزخ کے مناظر بھی بیان کیے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ میں نیچے چلتا گیا، نیچے اندھیرا تھا، لوگ بری طرح چیخ چلا رہے تھے، وہاں آگ تھی، وہ لوگ مجھ سے پینے کے لیے پانی مانگ رہے تھے، انٹرویو کرنے والے نے پوچھا کہ کیا آپ کسی سرنگ کے ذریعے نیچے گئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں، وہ سرنگ سے زیادہ بڑی چیز تھی، میں تیرتا ہوا نیچے جا رہا تھا، پوچھا گیا کہ وہاں کتنے آدمی چیخ پکار کر رہے تھے؟ اور ان کے جسم پر کپڑے تھے یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اتنے تھے کہ آپ انہیں شمار نہیں کر سکتے، میرے خیال میں ایک ملین ضرور ہوں گے اور ان کے جسم پر کپڑے نہیں تھے۔ (The Light Beyond p.26,27)

ان تمام مشاہدات کی حقیقت کیا ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مغربی ملکوں میں پر اسراریت کا شوق ایک جنون (craze) کی حد تک بڑھتا جا رہا ہے اور یہ کتابیں اسی جنون کا شاخسانہ ہو سکتی ہیں، اگرچہ اس احتمال کو بالکلیہ صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، لیکن ۱۹۷۵ء کے بعد سے مختلف سنجیدہ حلقوں نے ان واقعات کا نوٹس لیا ہے اور ان پر جس طرح ریسرچ کی گئی ہے، اس کے پیش نظر یہ احتمال خاصہ بعید ہوتا جا رہا ہے، ڈاکٹر مودی نے اس احتمال پر بھی خاصی تفصیل سے بحث کی ہے کہ جن لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کیا وہ بے بنیاد گپ لگانے کے شوقین تو نہیں تھے، لیکن بالآخر نتیجہ یہی نکالا ہے کہ اتنے سارے آدمیوں کا جو مختلف علاقوں اور مختلف طبقہ ہائے خیال سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی قسم کی گپ لگانا انتہائی بعید از قیاس ہے۔

بعض ڈاکٹروں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ بعض منشیات اور دواؤں کے استعمال سے بھی اس قسم کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں، جن میں انسان اپنے آپ کو ماحول سے الگ محسوس کرتا ہے اور بعض اوقات اس کا دماغ جھوٹے تصورات کو مرئی شکل دے دیتا ہے، ایسے میں اسے بعض پر فریب نظارے (hallucinations) نظر آنے لگتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان افراد کو اسی قسم کی کسی کیفیت سے سابقہ پیش آیا ہو، لیکن ڈاکٹر مودی نے دونوں قسم کی کیفیات کا الگ الگ تجزیہ کرنے کے بعد یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جن لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کیا۔ بظاہر ان کے مشاہدات ان پُر فریب نظاروں سے مختلف تھے، ڈاکٹر میلون مورس نے اس احتمال پر زیادہ سائنٹفک انداز میں تحقیق کرنے کے بعد اپنا حتمی نتیجہ یہ بتایا ہے کہ یہ مشاہدات (hallucinations) نہیں تھے۔

انہوں نے اس احتمال پر بھی گفتگو کی ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی تصورات ان کے ذہن پر اس طرح مسلط تھے کہ بے ہوشی یا خواب کے عالم میں وہی تصورات ایک محسوس واقعے کی شکل میں ان کے سامنے آ گئے۔ ڈاکٹر موڈی نے اس احتمال کو بھی بعید قرار دیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی، ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو مذہب کے قائل نہ تھے، یا اس سے اتنے بے گانہ تھے کہ ان پر مذہبی تصورات کی کوئی ایسی چھاپ غالب نہیں آ سکتی تھی۔

پھر یہ مشاہدات کیا تھے؟ ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اور اس بارے میں قرآن وسنت سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ اس موضوع پر ان شاء اللہ آئندہ ہفتے کچھ عرض کروں گا۔

۱۸ محرم ۱۴۱۷ھ
۵ جون ۱۹۹۶ء
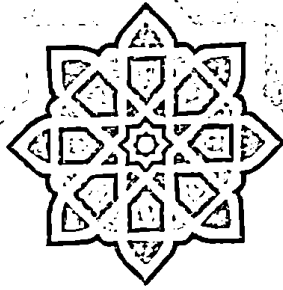
موت کی حقیقت
(۳)

دنیا کے اس پار

(ذکر وفکر ص ۲۴۰)
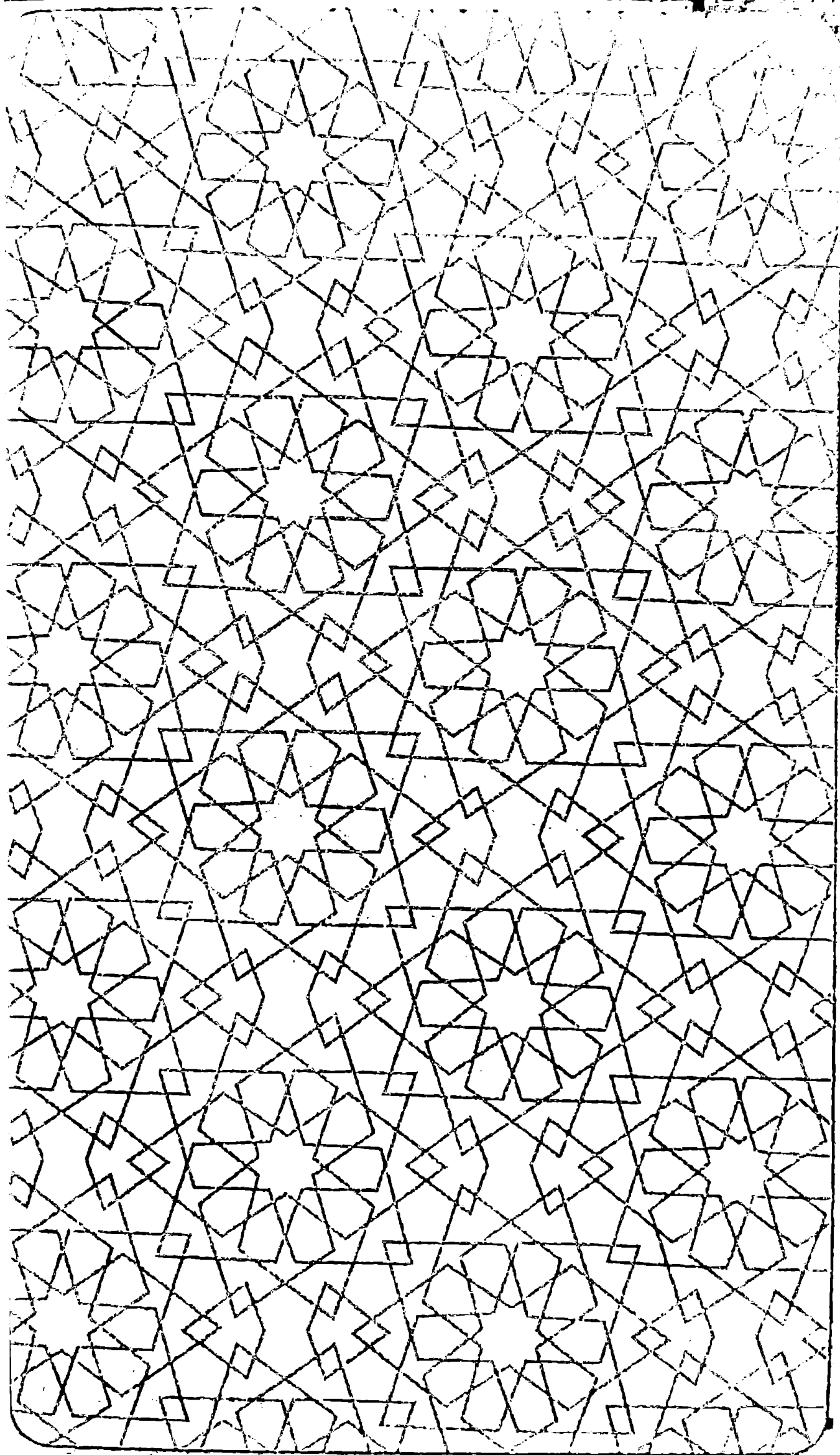
بسم اللہ الرحمن الرحیم

موت کی حقیقت (۳)
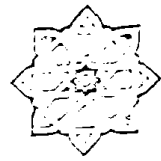
پچھلی دو قسطوں میں میں نے ان لوگوں کے بیانات کا خلاصہ ذکر کیا تھا جو موت کے دروازے پر پہنچ کر واپس آ گئے، انہوں نے اپنے آپ کو اپنے جسم سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا، ایک تاریک سرنگ سے گزرے، ایک نورانی وجود کا مشاہدہ کیا اور پھر اس نورانی وجود نے ان کے سامنے ان کی سابقہ زندگی کا پورا نقشہ پیش کر دیا۔

یہ بات تو واضح ہے کہ ان لوگوں کو موت نہیں آئی تھی، اگر موت آ گئی ہوتی تو یہ دوبارہ دنیا میں واپس نہ آتے، خود ڈاکٹر مودی جنہوں نے ان لوگوں کے بیانات قلمبند کیے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے موت نہیں دیکھی، البتہ موت کے نزدیک پہنچ کر کچھ عجیب و غریب مناظر ضرور دیکھے، چنانچہ ان مشاہدات کے لیے انہوں نے جو اصطلاح وضع کی ہے، وہ Near - death Experiences (قریب الموت تجربات) جسے مخفف کر کے وہ N.D.E سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی اصطلاح بعد کے مصنفین نے بھی اپنالی ہے، لہٰذا اگر ان لوگوں کے بیانات کو سچ مان لیا جائے اور ڈاکٹر مودی کی حتمی رائے یہ ہے کہ اتنے

بہت سے افراد کو بیک وقت جھٹلانا ان کے لیے آسان نہیں، تو بھی یہ بات ظاہر ہے کہ انہوں نے موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ از خود رفتگی کے عالم میں انہیں اس جہاں کی کچھ جھلکیاں نظر آئی جس کا دروازہ موت ہے۔

میڈیکل سائنس چونکہ صرف ان چیزوں پر یقین رکھتی ہے جو آنکھوں سے نظر آجائیں، یا دوسرے حواس کے ذریعے محسوس ہو جائیں، اس لیے ابھی تک وہ انسانی جسم میں روح نامی کسی چیز کو دریافت نہیں کرسکی اور نہ روح کی حقیقت تک اس کی رسائی ہوسکی ہے، (اور شاید روح کی مکمل حقیقت اسے جیتے جی کبھی معلوم نہ ہو سکے، کیونکہ قرآنِ کریم نے روح کے بارے میں لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہ فرما دیا ہے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ [1] لیکن قرآن و سنت سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ زندگی جسم اور روح کے مضبوط تعلق کا نام ہے اور موت اس تعلق کے ٹوٹ جانے کا۔

اس سلسلے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہم اپنی بول چال میں موت کے لیے جو وفات کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ قرآنِ کریم کے ایک لفظ توفی سے مأخوذ ہے، قرآنِ کریم سے پہلے عربی زبان میں یہ لفظ موت کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا تھا، عربی زبان میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے تقریباً چوبیس الفاظ استعمال ہوتے تھے، لیکن وفاۃ یا توفی کا اس معنیٰ میں کوئی وجود نہیں تھا، قرآنِ کریم نے پہلی بار یہ لفظ موت کے لیے استعمال کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ

---

(۱) سورۃ الإسراء آیت (۸۵).

زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے موت کے لیے جو الفاظ وضع کیے تھے، وہ سب ان کے اس عقیدے پر مبنی تھے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، قرآنِ کریم نے توفی کا لفظ استعمال کر کے لطیف انداز میں ان کے اس عقیدے کی تردید کی، توفی کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا اور موت کے لیے اس لفظ کو استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ موت کے وقت انسان کی روح کو اس کے جسم سے علیحدہ کر کے واپس بلا لیا جاتا ہے، اسی حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کرتے ہوئے سورۂ زمر میں قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں کی موت کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو لوگ مرے نہیں ہوتے، ان کی روحیں ان کی نیند کی حالت میں واپس لے لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک معین وقت تک چھوڑ دیتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

دوسری طرف حضرتِ آدم علیہ السلام کو زندگی عطا کرنے کے لیے قرآنِ کریم نے ان کے اندر روح پھونکنے سے تعبیر فرمایا ہے (۲)، قرآنِ کریم کے ان

---

(۱) سورۃ الزمر آیت (۴۲).

(۲) ملاحظہ ہو سورۃ الحجر آیت (۲۹)، و سورۃ ص آیت (۷۲).

ارشادات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ زندگی نام ہے جسم کے ساتھ روح کے قوی تعلق کا، جسم کے ساتھ روح کا تعلق جتنا مضبوط ہو گا، زندگی کے آثار اتنے ہی زیادہ واضح اور نمایاں ہوں گے اور یہ تعلق جتنا کمزور ہوتا جائے گا زندگی کے آثار اتنے ہی کم ہوتے جائیں گے۔ بیداری کی حالت میں جسم اور روح کا یہ تعلق نہایت مضبوط ہوتا ہے، اس لیے اس حالت میں زندگی اپنی بھرپور علامات اور مکمل خواص کے ساتھ موجود ہوتی ہے، اس حالت میں انسان کے تمام حواس کام کر رہے ہوتے ہیں، اس کے تمام اعضاء اپنے اپنے عمل کے لیے چوکس اور تیار ہوتے ہیں، انسان اپنے اختیار کو پوری طرح استعمال کرتا ہے اور اس کے سوچنے سمجھنے پر کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہوتی، لیکن نیند کی حالت میں جسم کے ساتھ روح کا تعلق قدرے کمزور پڑ جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سونے کی حالت میں انسان پر زندگی کی تمام علامتوں کا ظہور نہیں ہوتا، وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، نیند کی حالت میں وہ اپنے اختیار سے اپنے اعضاء کو استعمال نہیں کر سکتا، نہ اس وقت معمول کے مطابق سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی روح کا تعلق جسم کے ساتھ اتنا مضبوط ضرور ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر وارد ہونے والے واقعات کا احساس باقی رہتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اس کے جسم میں سوئی چبھو دے تو اس کی تکلیف محسوس کر کے وہ بیدار ہو جاتا ہے۔

نیند سے بھی آگے ایک اور کیفیت بے ہوشی کی ہے، اس کیفیت میں جسم کے ساتھ روح کا رشتہ نیند کی حالت سے بھی زیادہ کمزور ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مکمل بے ہوشی کی حالت میں انسان کے جسم پر نشتر بھی چلائے جائیں، تو اسے

تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور بے ہوشی کی اسی صفت سے فائدہ اٹھا کر اس حالت کو بڑے بڑے آپریشنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس حالت میں انسان کے جسم سے زندگی کی بیشتر علامات اور خاصیتیں غائب ہو جاتی ہیں، البتہ دل کی دھڑکن اور سانس کی آمد و رفت باقی رہتی ہے جس سے اس کے زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

بے ہوشی سے بھی آگے ایک اور کیفیت بعض لوگوں پر شدید بیماری کے عالم میں طاری ہوتی ہے جسے عرفِ عام میں ''کومہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس حالت میں زندگی کی تمام ظاہری علامات ختم ہو جاتی ہیں اور صرف عام آدمی ہی کو نہیں، ڈاکٹر کو بھی بظاہر زندگی کی کوئی رمق معلوم نہیں ہوتی، دل کی دھڑکن بند ہوجاتی ہے، سانس رک جاتا ہے، بلڈ پریشر غائب ہو جاتا ہے، جسم کی حرارت تقریباً ختم ہو جاتی ہے، لیکن دماغ کے کسی مخفی گوشے میں زندگی کی کوئی برقی رو باقی ہوتی ہے، یہی وہ حالت ہے جس میں ڈاکٹر صاحبان آخری چارۂ کار کے طور پر تنفس یا دل کی دھڑکن کو بحال کرنے کے لیے کچھ مصنوعی طریقے آزماتے ہیں، بعض افراد پر یہ طریقے کامیاب ہو جاتے ہیں اور مریض اس عمل کے بعد معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے اور اس کے واپس آجانے ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ابھی تک مرا نہیں تھا اور اس کی روح بالکلیہ جسم سے جدا نہیں ہوئی تھی، یہ زندگی کا کمزور ترین درجہ ہے جس میں روح کا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ معمولی سا رہ جاتا ہے۔

پھر روح کا تعلق جسم سے جتنا کمزور ہوتا ہے، اتنی ہی وہ جسم کی قید سے آزاد ہوتی ہے، نیند کی حالت میں یہ آزادی کم ہے، بے ہوشی کی حالت میں اس

سے زیادہ اور سکتے کی حالت میں اس سے بھی زیادہ، لہٰذا جاننے کی یہ حالت جس میں روح کا تعلق جسم کے ساتھ بہت معمولی رہ جاتا ہے اور وہ جسم کی قید سے کافی حد تک آزاد ہو چکی ہوتی ہے، اس حالت میں اگر کسی انسان کا ادراک اپنی روح کے سفر میں شریک ہو جائے اور اسے مادی زندگی کے اس پار دوسرے عالم کی کوئی جھلک نظر آ جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں اور تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں اس قسم کے لوگوں نے عالمِ بالا کے کچھ مناظر کا مشاہدہ کیا، جن لوگوں کے بیانات میں نے پیچھے ڈاکٹر مودی کے حوالے سے نقل کیے ہیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ جھوٹ اور دھوکے کے عمل دخل سے خالی ہیں تو ان کے یہ مشاہدات بھی اسی نوعیت کے ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رکھنا ضروری ہیں:

① جن لوگوں کو یہ مناظر نظر آئے انہیں ابھی موت نہیں آئی تھی، لہٰذا جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ دوسرے جہاں کی جھلکیاں تو ہو سکتی ہیں، لیکن مرنے کے بعد پیش آنے والے واقعات نہیں۔

② جس حالت میں ان لوگوں نے یہ مناظر دیکھے وہ زندگی ہی کی ایک حالت تھی اور کم از کم دماغ کے مخفی گوشوں میں ابھی زندگی باقی تھی، لہٰذا ان نظاروں میں دماغ کے تصرف کا امکان بعید از قیاس نہیں۔

③ جن لوگوں نے اپنے مشاہدات بیان کیے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان مشاہدات کی تفصیل وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے، پھر بھی انہوں نے یہ کیفیات بیان کرنے کے لیے محدود لفظوں ہی کا سہارا لیا ہے، چنانچہ یہ بات اب بھی مشکوک ہے کہ وہ الفاظ

کے ذریعے ان کیفیات کو بیان کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟ نیز انہیں کون سی بات کتنی صحت کے ساتھ یاد رہی؟

ان وجوہ سے ان مشاہدات کی تمام تفصیلات پر بھروسہ تو نہیں کیا جا سکتا، نہ انہیں ما بعد الموت کے بارے میں کسی عقیدے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے، ما بعد الموت کے جتنے حقائق ہمیں معلوم ہونے ضروری ہیں وہ وحی الٰہی کے بے غبار راستے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں پہنچا دیے ہیں اور وہ اپنی تصدیق کے لیے اس قسم کے بیانات کے محتاج نہیں، لیکن ان مشاہدات کی بعض باتوں کی تائید قرآن وسنت کے بیان کردہ حقائق سے ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً ان تمام بیانات کی یہ قدرِ مشترک قرآن وسنت سے کسی شک وشبہ کے بغیر ثابت ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی حد تک محدود نہیں جو ہمیں اپنے گرد وپیش میں پھیلی نظر آتی ہے، بلکہ دنیا کے اس پار ایک عالَم اور ہے، جس کی کیفیات کا ٹھیک اِدراک ہم مادی کثافتوں کی قید میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ وہاں پیش آنے والے واقعات زمان ومکان کے ان معروف پیمانوں سے بالاتر ہیں جن کے ہم دنیوی زندگی میں عادی ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک کام جسے انجام دینے کے لیے سالہا سال درکار ہوتے ہیں وہ ایک لمحے میں کیسے انجام پا سکتا ہے؟ لیکن وہاں پیش آنے والے واقعات وقت کی اس قید سے آزاد ہیں، قرآنِ کریم فرماتا ہے:

وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (۱)

تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی کے لحاظ سے ایک ہزار سال کے برابر ہے

---

(۱) سورۃ الحج آیت (۴۷)۔

یہ عالَم کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس تک پہنچنے کے لیے کس قسم کی تیاری ضروری ہے؟ یہی باتیں بتانے کے لیے انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے ہیں، کیونکہ یہ باتیں ہم صرف اپنے حواس اور اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتے، آخری دور میں ہمیں یہ باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی شریعت کے ذریعے بتادیں ہیں اور جسے اس عالَم کے لیے ٹھیک تیاری کرنی ہو، وہ اس شریعت کو سیکھ لے، اس پر اس عالَم کے حقائق بھی واضح ہو جائیں گے اور وہاں تک پہنچنے کا صحیح طریقہ بھی آجائے گا۔

۲۵ / محرم ۱۴۱۷ھ

۱۲ / جون ۱۹۹۶ء

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مَوَاعِظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا
موضوع وار مجموعہ
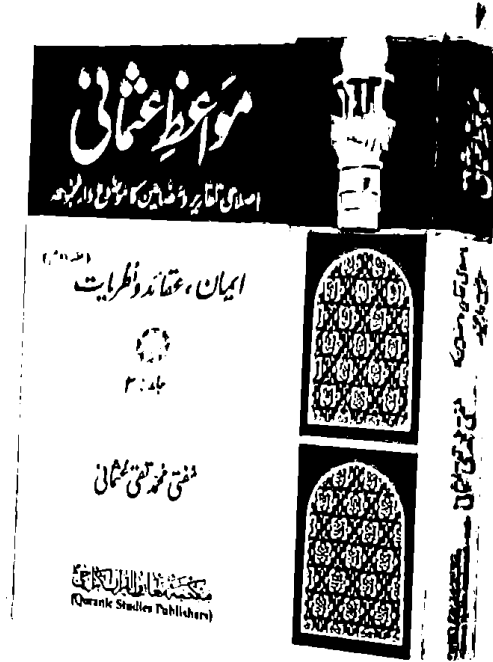
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شُعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکروفکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفردرسفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)